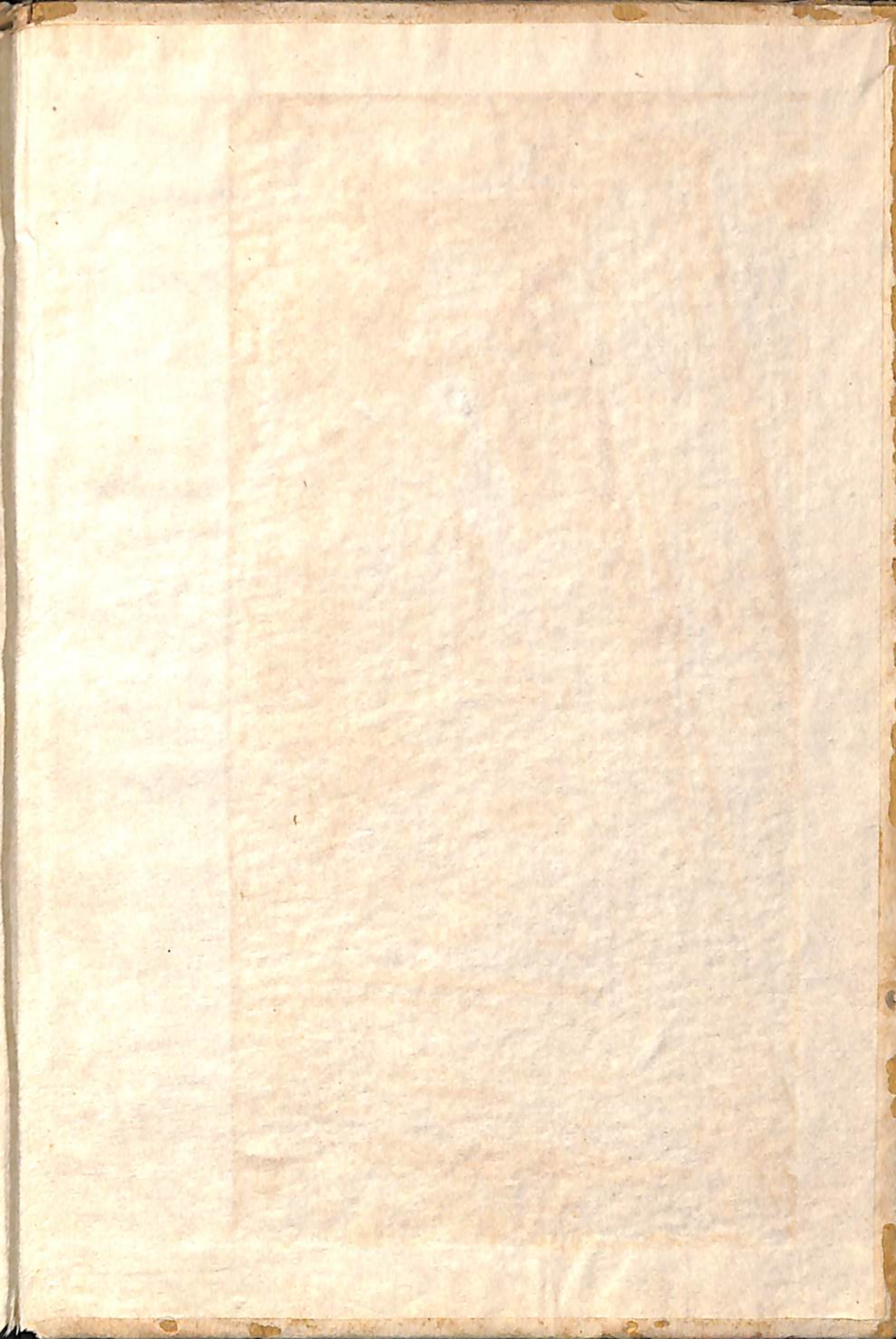


بیاد دوست دیرینه صباحی
کاندر خشکسالی سالها!

[illegible]

۲۵ خرداد ۸۰

اداس شام کے آخری لمحے

کشمیری لال ذاکر

ناشر

مودڑن پبلشنگ ہاؤس

۹۔ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج

نئی دہلی ۲۔۰۰۰۱۱

بار اول :- نومبر ۱۹۷۹ء
زیر اہتمام : پریم گوپال متل
مطبع :- نعمانی پریس - دہلی

قیمت : ۱۲ روپے

(حکومتِ ہریانہ کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی)

۳

اس بات کو بہت عرصہ نہیں گذرا

شملہ کی رِج پر تم مجھے اچانک مل گئی تھیں۔ ہم بہت برسوں بعد ملے تھے۔ جہاں ہمیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں بہت دیر نہیں لگی وہاں ہمیں اپنے ماضی میں لوٹ جانے میں بھی بہت وقت نہ لگا۔ لمحات کے گذرتے ہوئے ایک ریلے نے ایک بار پھر اپنی پوری شدّت سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رِج کی ایک بنچ پر تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم ڈیوی کوز میں چلے گئے اور ریستوران کے ایک کونے میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ تم نے میرے لئے بہت کم شکر کی چائے بنائی اور بولتی چلی گئیں میں تمھیں دیکھ بھی رہا تھا چائے بھی سِپ کر رہا تھا، بیچ بیچ میں مسکرا بھی دیتا تھا لیکن یہ سب کچھ میکانکی انداز میں تھا۔ شاید تم نے میرے من کی حالت جان لی تھی۔ تم میرے من کی حالت کتنی جلدی جان لیا کرتی تھیں۔ جبھی تو ایک بار تم نے کہا تھا۔

"جتنا میں تمھیں پہچانتی ہوں، شاید تم خود بھی اپنے آپ کو اتنی گہرائی سے نہیں پہچانتے"۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو"۔

"شاید نہیں، یقیناً"۔

"یقیناً"، میں تائید کرتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

لیکن یہ بہت برس پہلے کی گفتگو تھی جسے میں اب یاد کر رہا تھا اور شاید اسی لیے آپ سے آپ مسکرا بھی دیا تھا۔ تمھاری اس لمحہ کہی کسی بات پر نہیں، کسی بیتے ہوئے لمحے

کی کسی بیتی ہوئی بات پر۔ جبھی تو تم نے ٹوک دیا تھا۔

"پھر کوئی کہانی لکھ رہے ہو کیا؟"

میں چونکا۔ میرے پہلو میں تم بیٹھی تھیں۔ ڈیوی کوز کے اُس سکون دِہ کارنر میں جہاں بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ سب ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے۔ میں نے ایک بار خالی خالی نظروں سے تمہاری طرف دیکھا جیسے تمہیں بہت دور سے دیکھ رہا تھا اور پہچان رہا تھا۔

"تم میرے قریب ہوتے ہوئے بھی کہانیاں ہی لکھتے رہے۔ میری قربت سے کبھی لطف اندوز نہیں ہوئے۔"

"یہ میری ذہنی مجبوری تھی۔"

"اور اسی لیے تم مجھے بھی باندھ کر نہ رکھ سکے۔"

"میں باندھنے میں نہیں مُکت کرنے میں وشواش رکھتا ہوں۔"

"دوسروں کو مکت کرنے میں اور اپنے آپ کو اپنے فن کی سیماؤں میں باندھتے ہیں۔"

"شاید"

"تم جس ماحول میں بھی رہے اس کا کبھی لطف نہ اٹھا سکے۔ تمہارا دماغ، قلم اور کاغذ کے بغیر ہی کہانیاں لکھتا رہا۔ جانتے ہو بغیر قلم اور کاغذ کے کہانیاں لکھنے کا کیا انجام ہوتا ہے؟"

"تمہارے جانے کے بعد فوراً جان گیا تھا۔"

اتنی مدت کے بعد تمہارے ملنے پر جو خوشی مجھے ہوئی اور تمہارے جذبات میں جو اتھل پتھل ہوئی اس کا لطیف اور مہربان احساس بھی میرے ذہن میں ایک کہانی کے

روپ میں ہی ڈھلتا رہا۔ تمہارے قریب بیٹھ کر، تمہاری قربت سے زیادہ مجھے تمہارے دوبارہ جدا ہونے کے تلخ احساس کا کرب کچوٹتا رہا اور جب ہم ریستوران سے نکل کر دوبارہ رِج پر پہنچے تو تم سے زیادہ میرے قریب اس وقت اس کہانی کا عنوان تھا جسے میں چھو کر، محسوس کر کے، چوم کر، دیکھ کر، اپنے دل سے لگائے ہوئے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا تمہارے ساتھ چل رہا تھا۔

اس سے اگلے روز تم چلی گئیں اور میں دیر تک تمہاری پرچھائیں میں ڈھلتے ہوئے اپنی نئی کہانی کے عنوان کو تھامے بس اسٹینڈ کی ایک طرف خاموش اور گُم سُم کھڑا رہا۔

تم بہت برسوں کے بعد ملیں، پھر دوبارہ جُدا ہو گئیں اور میں ایک کہانی لکھ کر تمہاری قربت کے لمحوں کو ابدیت بخشتا رہا۔

کہانیاں مجھے ایسے ہی ملی ہیں۔
کبھی بچھڑیں کھو کر، کبھی تنہائی کا زہر پی کر۔
کبھی سچائی کی آنچ میں سسک کر، کبھی ناانصافی اور جھوٹ کی آگ میں جل کر۔
کبھی سکون کی چاندنی میں شانتی پا کر اور کبھی کرب کی کڑی دھوپ میں جھلس کر۔
کبھی گلاب کی پنکھڑی، کبھی ببول کا پھول۔
کبھی کسی معصوم چہرے کی لو۔ کبھی کسی کرخت بول کا نشتر۔
کبھی پیار کی کرن، کبھی نفرت کی چنگاری۔
کبھی دوستوں کی شفقت، کبھی ان کی بے مروتی۔
کبھی صدیوں کا گہرا درد، کبھی ایک لمحے کی طمانیت۔

کبھی غلامی اور مجبوری کا جان لیوا احساس اور کبھی زمان کی گہری سنگلشتی ۔

میری کہانیوں کی بس یہی داستان ہے ۔

یہ داستان صرف میری ہی نہیں بلکہ ہر فنکار کی ہے ۔

وہ پل پل، ڈگر ڈگر، پگ پگ، منزل منزل، یگ یگ اسی تجسس میں مصروف ہے اُسے جہاں کہیں جو کچھ ملتا ہے اُسے اپنی جھولی میں ڈال لیتا ہے ۔ پڑھتا نہیں صرف جمع کرتا رہتا ہے اور جب اس کی جھولی بھر جاتی ہے تو اپنے احساس کی شفاف چادر پر انڈیل دیتا ہے ۔ اپنی ساری جھولی خالی کر ڈالتا ہے ۔ اب تک جو کچھ سمیٹا ہے وہ سب اپنے سامنے بکھیر کر اسے نہارتا رہتا ہے اور پھر اپنی نگاہوں سے اُس ڈھیر کو کریدتا ہے اور اس میں سے اپنی قدروں کی چمٹی سے اٹھا اٹھا کر کچھ چیزوں کو ایک طرف رکھتا جاتا ہے ۔ اتنے بڑے ڈھیر میں سے جو اس نے دن رات کی محنت کے بعد اکٹھا کیا ہے کچھ سیپیاں، کانچ کے ٹکڑے، پھولوں کی پنکھڑیاں، دھوپ کی پرچھائیں، زلف کی لٹ، ہونٹوں کی تھرکن، بدن کی خوشبو، دکھ کی سوئیاں، غم کے نشتر اور شکستوں کے زخم نکال کر الگ کر لیتا ہے اور باقی سب کباڑ خانہ راستوں کی دھول میں پٹک دیتا ہے ۔

انھی منتخب شدہ، اکٹھی کی ہوئی اکائیوں سے وہ اپنے فن کے تانے بانے بنتا ہے اور ننگے جسموں کو خوبصورت پیراہن، افسردہ ہونٹوں کو مسکراہٹیں، غم آلود دلوں کو تسکین اور محتاج روحوں کو برکتیں دیتا ہے اور لوگ اُسے ایک بہت اچھا کہانی کار یا کوی کہہ کر اس کی قیمت چکا دیتے ہیں کبھی اسے ایک عام قسم کا فنکار کہہ کر اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں اور کبھی ایک تھرڈ ریٹ قلم کار کہہ کر اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ اس کی دن رات کی ریاضت کا بس یہی صلہ ہے ۔

فنکار کا اپنا تو کچھ بھی نہیں۔
نہ اس کا قلم نہ اس کا برش۔
نہ اُس کا اسٹائیل نہ اُس کا تخیل۔
نہ اُس کی کہانی نہ اُس کی غزل۔
نہ اُس کا راگ، نہ اُس کا ساز۔

وہ دوسروں کے لیے جیتا ہے اور دوسروں ہی کے لیے مرتا ہے۔ اس کی صدا یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ زندگی کو پہلے سے زیادہ اچھی، خوبصورت اور جینے کے قابل بنائے۔ لوگ زندگی سے پیار کریں، اسے ٹھکرائیں نہیں۔ وہ اپنے مستقبل میں وشواس رکھیں، اس پر سے اپنا یقین نہ اٹھائیں مستقبل انسان کے لیے، انسان مستقبل کے لیے۔
وقت اور ماحول کے خلاف مستقل اور مسلسل جدوجہد ہی انسان کی تقدیر ہے!

فن کی تخلیق دراصل فنا کے خلاف ایک ابدی جنگ ہے فن ایک بھرپور کوشش ہے زندہ رہنے کی، اپنے جسمانی وجود کے خول سے نکل کر تاریخ کے صفحوں میں سما جانے کی۔ فنکار جب مر جاتے ہیں تو تاریخ انھیں ابدیت بخش دیتی ہے تخلیق کا یہ عمل جب سے جاری ہے جب انسان نے پہلا حرف لکھنا سیکھا تھا جب اس نے کاغذ کے بجائے دھرتی پر پہلی لکیر کھینچی تھی۔ جب اس نے بنا ساز کے ہی پہلی مترنم آواز فضا میں بکھیری تھی۔ فنا کے خلاف جدوجہد کی یہ پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔ جوں جوں فن کی منزلیں طے ہوتی گئیں اور اس میں نکھار آتا گیا موت کے خلاف انسان کی جدوجہد زیادہ استوار اور منظم ہوتی گئی۔ فنکار نے یہ جان لیا کہ موت پر فتح پانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے فن کی پرستش، اپنے خون سے دِن

رات کے اُجالے اور اندھیرے کے کینوس پر اپنے دور کے خدوخال کی تصویر کشی کرتا۔ فنکار انہی آڑھی ترچھی لکیروں اور الفاظ کی مدھم اور شوخ شکلوں کی مدد سے اپنے آپ کو ابدیت دیتا ہے۔ یہی کوشش ترقی پسندی بھی ہے، ادب میں افادیت بھی ہے، حقیقت نگاری بھی ہے اور عوام کے احساسات اور جذبات کی تصویر کشی بھی ہے۔ فنکار عوام اور ماحول اور وقت کے جتنا قریب ہوگا اس میں مر کر زندہ رہنے کی اتنی ہی صلاحیت اور توفیق ہوگی۔
فنکار کا اپنی تخلیقات سے وہی رشتہ ہے جو خدا کا اپنی مخلوق سے!

کشمیری لال ذاکر

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء
چنڈی گڑھ۔

اداس شام کے آخری لمحے

آج کی شام بے حد اداس ہے۔
صبحیں، شامیں، دن اور رات تب اُداس اور تھکے تھکے
اور نڈھال محسوس ہوتے ہیں۔ جب اپنا دل اداس، تھکا ہوا
اور نڈھال ہو۔ صبح اور شام تو کیا بھری پری زندگی ایک دم
ویران ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب دل کے کھنڈریں گہری خاموشی
چھا جائے اور حسرتوں کے چراغ دھیرے دھیرے بجھ جائیں اور
کہیں سے کسی کی آواز نہ آئے، قدموں کی چاپ نہ ہو، دھڑکنوں
کی سرگوشی نہ ہو، ہونٹوں کے دیپک نہ جلیں اور گالوں کے
پھول مرجھا جائیں۔ پھر زندگی اور ایک لق و دق صحرا میں فرق
ہی کیا رہ جاتا ہے —— آج میرے دل کے آنگن میں ایک
گہرا سناٹا ہے، اندھیرا ہے، حسرتوں کے چراغ سلگ رہے ہیں
اور ایک بے حد غمناک بُو فضا میں لہرا رہی ہے۔
آج صبح سے فانی کے شعر گنگنا رہا ہوں۔ آنکھ کھلتے ہی
دن کی روشنی کے بجائے شام کا دھندلکا ذہن میں بھرنے لگا تھا۔

یاسیت نے دل و دماغ کو گھیر لیا تھا اور اب ریسٹ ہاؤس کے ایک بہت نفیس آراستہ کمرے میں پلنگ پر لیٹا فانیؔ کا یہ شعر گنگنا رہا ہوں ؎

چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید
کہ آج بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

اور بارش میں بھیگے بستر سے پنکھے کی ہوا میں ایک ہلکی سی باس آرہی ہے۔ مئی کے دوسرے ہفتے میں جب گرمی خوب ہونی چاہیے موسم برا نہیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن آندھی اٹھتی ہے اور پھر بارش کے چھینٹے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے تو لُو کے ریلے ابھی گلی بازاروں میں انسانوں کا پیچھا نہیں کر رہے ہیں۔ جب گھر سے چلا تھا بارش جبھی ہو رہی تھی۔ پہلے زور کی آندھی اٹھی تھی، پھر آسمان میں مٹیالے بادلوں کی بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور پھر پانی برسنے لگا تھا۔ ہولڈال بس کی چھت پر پڑا بھیگتا رہا تھا۔ حالانکہ کنڈکٹر نے ترپال بچھا رکھی تھی۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اپنا بازو باہر نکالے بوچھاڑ کا لطف اٹھا رہا تھا اور یہ سوچ کر کہ بستر محفوظ ہے، اپنے اردلی کو بھی چھت پر چڑھ کر ایک بار دیکھ لینے کو نہیں کہا تھا اور اب نیم گیلے بستر پر لیٹا، نیم گیلے ہی تکیے کو سر کے نیچے دبائے، آنکھیں موندے پڑا ہوں اور پنکھے کی ہوا میں دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طور پر عجیب سی بُو میرے ذہن پر منڈلانے لگی ہے۔ جیسے یہ اس کفن

ییں بسی بُو ہے جو میرے گرد لپٹا ہے۔ جیسے میں ایک تابوت میں بند ہوں اور میرا دم گھٹ رہا ہے اور میں چیخنا چاہتا ہوں، لیکن چیخ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں مردہ ہوں اور مُردے چیخ نہیں سکتے اور یہ تابوت میری زندگی کا ہے اور یہ کفن میرے ماضی کا ہے جو ریشمی ہے، لیکن سلوٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ جو ملائم ہے، لیکن بے داغ نہیں میرے جسم میں ایک جھرجھری سی ہوتی ہے اور میں اپنے جسم کو پھیلا دیتا ہوں۔ اپنی ٹانگوں کو پوری لمبی کر دیتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تابوت چرچرانے لگا ہے اور اس میں لگی کیلیں ہلنے لگی ہیں۔ میرے گرد لپٹا ہوا ریشمی کفن مسکنے لگا ہے۔ میں اپنا جسم سمیٹ لیتا ہوں۔ اپنی ٹانگیں سکیڑ لیتا ہوں اور ایک لمبی سانس لے کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہوں۔

تابوت کے باہر سے آواز آتی ہے۔

"کافی میز پر رکھ دی ہے صاحب!"

میری مُندی ہوئی آنکھیں کھُلتی ہیں۔ میرا اردلی سامنے کھڑا ہے، نہایت نفیس قالین پر خالی ٹرے ہاتھ میں لیے۔

"کون ہو تم؟"

میں پوچھتا ہوں۔

جیسے میں قبر کے اندر سے بول رہا ہوں اور مخاطب کر رہا ہوں کسی کو جو مٹی گرا رہا ہے میرے تابوت پر، مجھے دبانے کے لیے۔

"جی۔ رام پرتاپ۔"

"مٹی کیوں ڈال رہے ہو؟"

"جی نہیں، جوتا اتار کر اندر آیا ہوں سرکار! پاؤں میں مٹی نہیں ہے۔"

میں آنکھیں جھپکتا ہوں۔ ایک بار نہیں کئی بار اور پھر اچانک نہ جانے کیسے پلیٹ اور پیالی تپائی سے نیچے گر جاتی ہے۔ ایک چھناکا ہوتا ہے اور مجھے اپنے وجود کا احساس ہونے لگتا ہے میں مرا نہیں ہوں، زندہ ہوں۔ آدمی جب تک زندہ رہتا ہے اس کا ماضی زندہ رہتا ہے۔ وہ تو جب مرتا ہے جب اس کا ماضی مر جاتا ہے۔ جب گزرے ہوئے لمحوں سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب اسے کسی چبھے ہوئے کانٹے کی ٹیس کا احساس نہیں ہوتا۔ جب کسی سونگھے ہوئے پھول کی خوشبو اس کے ذہن میں نہیں آتی۔ جب کوئی دیکھا ہوا حسین چہرہ اپنی ضیا سے اسے نہیں نکھارتا۔ جب عارضوں کی کوئی صبح اور گیسوؤں کی کوئی شام اسے اپنے سینے سے لگا کر نہیں چومتی۔ یہی موت ہے، یہی فنا ہے، یہی مٹنا ہے۔

"تم اچھے ہو نا رام پرتاپ؟"

میں ذرا سا اٹھ کر پیٹھ کو پلنگ کی بیک سے لگا دیتا ہوں۔

"آپ کی کرپا ہے صاحب۔"

"تمہاری شادی کب ہے؟"
"جی اگلے مہینے۔"
"پہاڑوں میں تو دیوتا کو بلی دیتے ہیں نا؟"
"دیتے ہیں سرکار!"
"کیوں دیتے ہیں بلی؟"
"پرانے زمانے سے ایسا چلا آ رہا ہے۔"
تو رام پرتاپ بھی زندہ ہے اور اس کے پہاڑی گاؤں میں ابھی دیوتاؤں کو قربانیاں دی جاتی ہیں۔ شاید اسی لیے پہاڑی نوکر جب چھٹی لے کر شادی کرنے جاتے ہیں تو پھر واپس نہیں آتے۔ رام پرتاپ بھی واپس نہ آئے گا۔
ایسا محسوس ہوتا ہے تابوت پر بھُربھُری مٹی دھیرے دھیرے گر رہی ہے۔
"کافی بناؤں سرکار!"
"نہیں تم جاؤ۔ لیکن واپس آ جانا۔"
"مجھے آواز دے دینا صاحب! میں سامنے کچن میں ہوں۔"
رام پرتاپ چلا گیا ہے۔ میری بات کو نہیں سمجھتا۔ میں کبھی کبھی بہت عجیب باتیں اُس سے کہہ دیتا ہوں۔ جن پر سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوتا رہتا ہے اور پھر اپنے ساتھی اردلیوں سے بحثیں کرتا رہتا ہے۔ جاتے جاتے دروازہ بھڑا گیا ہے۔ موٹے نیلے پردے

پنکھے کی ہوا میں لرز رہے ہیں۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا ہے اور اب کافی کے ڈبّے سے کافی پیالی میں ڈال رہا ہوں۔ صرف کافی اور گرم پانی۔ دودھ یا شکر کچھ بھی نہیں۔ یہی پیتا ہوں اور اُن شاموں کو بار بار پیتا ہوں جب میں اداس ہوتا ہوں اور نہیں جانتا کہ کیوں اُداس ہوں۔ آنکھیں سلگتی ہیں، لیکن آگ کہیں نہیں ہوتی۔

کڑوی کافی کا ایک سِپ لے لیا ہے۔

کڑواہٹ کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتر گیا ہے۔

تو میں ابھی زندہ ہوں، کیونکہ کڑواہٹ کو محسوس کر سکتا ہوں

بچّے شکر زیادہ پسند کرتے ہیں، کیونکہ ان کا کوئی ماضی نہیں ہوتا اور جب اچھے خاصے بالغ ہو کر شکر کے لیے مرتے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ابھی یہ بچّے ہیں اور شاید بوڑھے ہوتے تک بچّے ہی رہیں گے۔ اور اُن کا کوئی ماضی نہ ہوگا جس کے ساتھ وہ بندھے ہوں گے۔ یہ ایسی کشتیاں ہیں جو کسی گھاٹ سے نہیں بندھی ہیں، بس لہروں کی سطح پر اِدھر اُدھر ہچکولے کھا رہی ہیں۔

میں نے سگریٹ کا ایک کش اور پھر کافی کا ایک اور گھونٹ لیا ہے۔

جی چاہتا ہے آج اُن کشتیوں کے بارے میں سوچوں جو بغیر کسی مانجھی کے بھٹکتی رہیں اور جنھیں کبھی کوئی گھاٹ نہ ملا اور جب کسی گھاٹ نے بانہیں پھیلا کر انھیں اپنی آغوش میں لینا چاہا تو

اُن کے بوسیدہ تختوں کے سوراخوں سے پانی اندر گھس آیا اور وہ
ان پانیوں میں ڈوب گئیں۔ جہاں ڈوبنے والی کشتیاں بھی تیرنے
لگتی ہیں۔ جہاں انھیں پانی نہیں ڈبوتا ان کی تقدیر ڈبوتی ہے۔
اٹیچیڈ روم کی کھڑکی سے جہاں میرا ہولڈ آل، سوٹ کیس،
تھرموس، آج کا اخبار اور رسالے پڑے ہیں، ہوا کا بہت ہی
تیز جھونکا داخل ہوا ہے۔ کمرے کے سارے پردے ایک دم
لرز اٹھے ہیں۔ دیوار کے ساتھ ہینگر میں لٹکتی میری گرے پینٹ
اور سندھ کھادی کی بش شرٹ جھولنے لگی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کے
باہر آگے نیم کے بڑے بڑے درختوں کے پتے پھڑ پھڑا رہے ہیں اور
ایک بوجھل اور بھاری آواز ابھر رہی ہے۔
ایک بار پھر آندھی اٹھی ہے۔
نیم کے درختوں کی ٹہنیاں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ یقیناً ٹوٹ
جائیں گی۔
نیم کے درخت تو یہاں سڑکوں کے دونوں طرف کھڑے ہیں
مارچ کے آخر اور اپریل کے شروع کے دنوں میں نیم کے پیلے پیلے
پتے ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس طرح اڑتے پھرتے ہیں جیسے وہ
کارواں سے بھٹک گئے ہوں اور پریشان حال ہر کسی سے قافلہ
سالار کا پتہ پوچھ رہے ہوں۔ ان دنوں نیم کی ٹہنیاں ننگی اور رنجی
ہوئی بہت ہی اداس اور غمناک منظر پیش کرتی ہیں۔ جیسے خزاں

کے ہاتھوں نے ان کی سرسبز ساڑیاں اتار کر تار تار کر دی ہوں اور انھیں ایک دم برہنہ کر دیا ہو۔ نیم کی شاخیں دروپدی تو نہیں ہیں جنھیں دریودھن کے ظالم ہاتھ ہزار کوشش کے باوجود ساڑی سے محروم نہ کر سکیں۔ یہ دھرتی سے اُگے ہوئے درخت ہیں جن کی حفاظت کرنے والا کوئی کرشن نہیں۔ یہاں سبھی دریودھن ہیں جو خزاں کے ہاتھ بن کر مہابھارت کی تاریخ دہراتے ہیں۔

ایک بہت ہی تیز جھونکا آیا ہے اور بے حد زوردار گڑگڑاہٹ ابھری ہے اور کسی بوجھل تنے کے کڑکنے کی آواز سُنائی دی ہے۔

کہیں کوئی درخت گرا ہے!

کہیں کوئی راہ گیر نیچے آکر کُچلا گیا ہے۔

ریسٹ ہاؤس کے روشن دان سے ریت کے ذرّے میرے بستر پر گر رہے ہیں۔ یہ ریت ساتھ لگتے ہوئے راجستھان سے اُڑ کر آئی ہے جس میں شاید وہ ذرّے بھی شامل ہیں جن پر ہلدی گھاٹی میں جذب ہوئے خون کے داغ ہیں۔ جس میں اس چتا کی راکھ کی سفیدی بھی شامل ہے جس میں پدمنی کے ساتھ سینکڑوں ناریاں جل مری تھیں۔ اس میں ہندوستانی روایات کی شرحی ہے، آن ہے اور وقار ہے۔

میں نے ریت کے اُن ذرّوں کو اٹھا کر اپنے ماتھے سے لگا لیا ہے، جیسے میں انھیں سلام کر رہا ہوں۔

رام پرتاپ نہ جانے کب آہستہ سے کمرے میں آکر کافی کا سامان اٹھا کر لے گیا ہے۔

میں نے ایک اور سگریٹ سلگایا ہے۔

آندھی تھم گئی ہے، سنّاٹا گہرا ہو گیا ہے۔

اداس شام اور بھی اداس ہو گئی ہے۔

یہ ریسٹ ہاؤس کسی زمانے میں راجہ کا محل تھا۔ عمارت پُرانی ہے لیکن اس میں عظمت کے آثار باقی ہیں۔ محل ٹوٹ کر کھنڈر بھی بن جائے پھر بھی اس کا وقار قائم رہتا ہے۔ یہ وقار زندگی کی بہت بڑی چیز ہے، چاہے وہ تاج محل کا ہو چاہے کسی جھونپڑی کا۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف کھلی سڑک ہے جس پر اس دن سُرخ بجری بچھا دی جاتی ہے جب کسی وی۔ آئی۔ پی کو آنا ہوتا، تارکول کی سڑک جو کوئی پچھتر میل کے بعد راجستھان کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ جن دنوں یہ محل بنا تھا آس پاس گھنا جنگل تھا اور یہاں راجہ شکار کھیلنے آیا کرتا تھا۔ گئی رات تک اِس محل میں راگ رنگ کی محفلیں جمی رہتی تھیں اور جب وہ سوتا تھا تو صبح اسے کوئی جگاتا نہ تھا۔ راجہ کو جگانے کا بہت ہی غیر معمولی ڈھنگ تھا۔ سات گھوڑوں پر سوار سات فوجی سپاہی خوبصورت وردیاں پہنے ریسٹ ہاؤس کے گرد بنی سڑک پر چکّر لگاتے تھے۔ پہلے آہستہ، پھر ذرا اور تیز، پھر اور تیز! اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز

سے راجہ جاگتا تھا اور اس عمل میں کوئی دو گھنٹے لگ جاتے تھے اور جاگتے ہی اس کی آواز گونجتی تھی۔

"ارے کوئی ہے؟"

اور درجنوں ملازم ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے حکم سننے کے لیے حاضر ہو جاتے تھے۔ راجہ صرف مسکرا دیتا تھا۔

"تم جا سکتے ہو!"

اور سب اسی طرح سر جھکائے چلے جاتے تھے۔

میں جب بھی اِس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتا ہوں ایک بار چھت پر ضرور جاتا ہوں۔ جہاں ایک اونچی محراب ہے جس میں بیٹھنے کی جگہ ہے اور جہاں سورج غروب ہونے کے بعد شہنائی نواز بہت مدھم آواز سے فضائیں نغمے کے پھول بکھیرتا تھا اور شام کے دھندلکے کو بے حد خوبصورت بنا دیتا تھا۔ اب اس محراب میں کبھی شہنائی کے سُر نہیں ابھرتے۔ لیکن مجھے سدا ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر شام فضا میں سنگیت گھلتا ہے اور اُن گانے والیوں کے قہقہے گونجتے ہیں جو کبھی اِس محل کی زینت بن چکی تھیں۔

لیکن آج کی اس شام کو چھت پر جانے کو بھی جی نہیں چاہتا بس یونہی بستر پر پڑے رہنے اور سوچتے رہنے ہی میں آسودگی محسوس ہو رہی ہے۔

مجھے اپنی زندگی ریسٹ ہاؤس کے مین گیٹ کے ایک پہلو میں بنے

ایک چھوٹے سے کمرے کی مانند نظر آرہی ہے جس میں ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار رہتا ہے۔ جب بھی کوئی چاہے اس کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے وقت کی کوئی قید نہیں۔ آنے والے عام طور سے چپراسی یا اردلی ہوتے ہیں جو ریسٹ ہاؤس کا کوئی سیٹ کھولنے کو کہتے ہیں اور وہ بوڑھا چوکیدار اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ چابیوں کا گچھا ہاتھ میں لیے دروازہ کھولنے چل پڑتا ہے اور اس کا اپنا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اس میں کوئی کنڈی نہیں، کوئی تالا نہیں۔ صرف کواڑ ہیں جو کبھی نہیں بھڑتے۔ اِس بوڑھے چوکیدار نے آج تک کسی سے ٹپ نہیں لی۔ صرف ایک بار رجسٹر میں نام پتہ درج کرانے آتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب کوئی جا رہا ہو۔ اس جھکی ہوئی کمر میں کتنا وقار ہے!

آج چلتے چلتے کوئی میرا دروازہ بھی کھٹکھٹا گیا تھا۔

بارش میں بھیگتے ہوئے جب میں بس کے اندر داخل ہوا تو مجھ سے پہلے میری ہی طرح بھیگتی ہوئی ایک عورت بھی اگلے دروازے سے داخل ہوئی اور فرنٹ سیٹ خالی دیکھ کر بیٹھنے لگی۔ سیٹ پر میرے اردلی نے میرا اخبار رکھ دیا تھا۔ اس نے مایوسی سے دوسری سیٹوں کی طرف دیکھا جو بھری پڑی تھیں۔ یہ آخری بس تھی اور مسافر ٹکٹ لے کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اس نے پھر فرنٹ سیٹ کی طرف دیکھا اور یوں کھڑی رہنا اچھا نہ سمجھ کر اخبار سیٹ سے اٹھا لیا اور بیٹھنے لگی۔

"یہ سیٹ خالی نہیں ہے۔" فرنٹ سیٹ کے پیچھے والی دو سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے میرے اردلی نے کہا۔

عورت کے سنہری بالوں میں اٹکے ہوئے پانی کے کچھ قطرے نیچے گر گئے۔

میں بس کے پچھلے دروازے میں سے داخل ہو کر سیٹوں کے درمیانی فاصلے میں سے گزر کر فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"کون بیٹھا ہے یہاں؟" عورت نے ساڑی کے گیلے پلّو کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب بیٹھے ہیں۔ وہ آ رہے ہیں!" میرے اردلی نے میری طرف اشارہ کیا۔

عورت نے ایک بار سیدھی کھڑی ہو کر میری طرف دیکھا اور پل بھر کے بعد نظریں جھکا لیں۔ فاختائی رنگ کی ساڑی کے ساتھ سیاہ بلاؤز اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ بھورے بالوں میں بارش کے پانی کی چمک تھی اور گورے چہرے پر پیاری معصومیت چھائی تھی۔ جواب برہمی سے اور بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگی تھی۔

میں آگے بڑھا تو وہ سیٹ سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میرا اخبار ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ٹکٹ لیا ہے آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

میرا اردلی اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"جی نہیں، بس بھر گئی ہے۔"

"ٹکٹ اب نہیں ملے گا صاحب۔" رام پرتاپ نے کہا۔

"تم اپنا ٹکٹ انھیں دے دو۔"

رام پرتاپ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسے لمحوں میں وہ مجھے بالکل نہیں پہچانتا۔ میں اس کے لیے ایک دم اجنبی بن جاتا ہوں۔

اس نے اپنی جیب میں سے دو ٹکٹ نکالے۔ ایک میرا اور ایک اپنا۔

"لیجیے" دونوں ٹکٹ اس نے میرے ہاتھ میں دے دیے۔

"آپ بیٹھیے" میں نے اس عورت سے کہا اور فرنٹ سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں میں وہاں بیٹھ جاتی ہوں" اس نے ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ وہیں بیٹھیے۔"

وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں نے رام پرتاپ والی سیٹ لے لی۔

"تم صبح آجانا رام پرتاپ!"

رام پرتاپ میرے سامنے کھڑا تھا۔

"لیکن آپ کو تکلیف ہو گی۔"

"نہیں، تم میری چنتا مت کرو۔" میں نے جواب دیا۔

"سامان کیسے سنبھالیں گے آپ؟" کتنا فکر مند تھا بے چارہ رام پرتاپ!

"آپ کا اردلی تو آپ کو بچوں کی طرح سنبھالتا ہے!" عورت نے پیچھے مڑ کر کہا اور مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ اور باہر گرتے ہوئے بارش کے قطروں میں مجھے بے حد مطابقت نظر آئی۔ مئی کی گرم دوپہر میں دونوں ہی تسکین بخشتی تھیں۔

"جی ہاں" میں مسکرا دیا۔

بس چلنے میں تھوڑی دیر تھی۔ رام پرتاپ نے کنڈکٹر سے کہہ کر سب سے پچھلی سیٹ پر جگہ حاصل کر لی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر نہ جانے کب اور کیسے اٹھ گیا، یہ مجھے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ بس جب اسٹارٹ ہوئی تو فرنٹ سیٹ والی عورت میرے پہلو والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور فرنٹ سیٹ پر ایک راجستھانی سیٹھ براجمان تھا۔

بات چیت کے دوران میں معلوم ہوا کہ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت ایک ڈاکٹر تھی جو کچھ روز ہوئے انبالہ سے تبدیل ہو کر آئی تھی اور اب رخصت لے کر گھر گئی تھی اور اس کا بھائی سامان وغیرہ لے کر ٹرک میں آرہا تھا جو شاید اگلی صبح پہنچے گا۔ وہ نئی جگہ کے بارے میں جاننے کے لیے سوال کرتی رہی اور اپنی پرانی جگہ کی تعریف کرتی رہی جہاں اس نے بہت اچھے دن گزارے تھے۔ اس نے لیڈی ہارڈنگ

میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور اب اسکالرشپ لے کر سرجری کی کوئی فارن ڈگری حاصل کرنے کے لیے امریکہ جانے کی سوچ رہی تھی۔

بارش اسی طرح ہو رہی تھی لیکن اس کے بھیگے ہوئے کپڑے بہت حد تک سوکھ گئے تھے۔ اس کے بال سنہرے اور گھنے تھے اس کے بازو سڈول اور گورے تھے۔ اس کی انگلیاں مخروطی تھیں اس کی ٹانگیں موٹی اور بھوری تھیں۔ اس کے ہونٹ پتلے اور ترشے ہوئے تھے۔ اس کے دانت چمکدار اور ہموار تھے اور اس کی گردن۔!

مجھے ایک دھکّا سا لگا۔ جیسے اندھیرے میں چلتے چلتے ایک بڑے سے پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔ گردن کی بائیں طرف پھلبیری کا ایک بہت بڑا سفید داغ تھا جو نیچے کی طرف پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اور نیچے دیکھا، بہت نیچے پاؤں کی طرف ساڑی سے نیم ڈھکے دونوں پاؤں کی انگلیاں ایک دم سفید ہو رہی تھیں۔

مجھے محسوس ہوا جیسے پتھر سے ٹکرانے سے میرے پاؤں سے خون بہنے لگا تھا۔

اور وہ جو اداس گھڑیوں کی سیاہی میں تسکین کی ہلکی سی دھوپ کھلی تھی، ایک دم مٹ گئی اور میں اپنے آپ میں یوں غرق ہوا کہ پھر کنارے پر نہ آسکا۔

ڈاکٹر اخبار پڑھتے پڑھتے اونگھ گئی تھی۔ بیچاری بیحد تھکی

ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔

اس کے جسم کے سفید داغ یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے زمین کے کسی ٹکڑے پر بہت سی چتاؤں کے جلنے سے بڑے بڑے جلے ہوئے سے دائرے پھیل جاتے ہیں . میرا جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر فرنٹ سیٹ پر چلا جاؤں جو میری سیٹ تھی اور جس پر اب بڑا جمان راجستھانی سیٹھ اونگھ رہا تھا ۔

بس سے اتر کر ریسٹ ہاؤس کی طرف آنے سے پہلے ڈاکٹر نے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی اور میں انکار نہ کر سکا تھا . لیکن طشتریوں کی طرح سفید سفید گول داغ میری نگاہوں میں گھومتے رہے تھے اور میری اداس شام جس نے صبح کے آ جانے کے ساتھ ہی جنم لے لیا تھا اور بھی اداس معلوم ہو رہی تھی ۔ اداس نڈھال اور مضمحل !

اور اب میں سوچ رہا ہوں کاش ڈاکٹر کا ملازم ریسٹ ہاؤس کا راستہ بھول جائے اور مجھ تک نہ پہنچ سکے اور میں ان چتاؤں سے جلی ہوئی ویران وادیوں کا سامنا کرنے سے بچ جاؤں جن میں یہ اداس شام مجھے پھینکنا چاہتی ہے ۔ کاش ایسا ہو سکے ۔ !

کاش ایسا کبھی ہوا ہو !

کاش ایسا ہو جائے !

کاش !

میرے ذہن کے کواڑ اب تک جھول رہے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے بوڑھے چوکیدار کے دروازوں کی طرح!

آندھی تھم جانے کے بعد ہلکی سی دھوپ نکلی ہے۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے کی دھوپ۔ کل پھر آندھی آئے گی اور مینہہ برسے گا۔ شاید کل اولے بھی پڑیں، شاید برف بھی۔ کون جانتا ہے۔ کل کی بات کون بتا سکتا ہے؟ آنے والے کل اور ایک صدی کے بعد طلوع ہونے والی صبح میں کیا فرق ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ دونوں ہی مستقبل کی تصویریں ہیں۔ کل شاید کچھ بھی نہ ہو۔ کل شاید شام آئے ہی نہیں۔ آئے تو شاید اتنی اداس نہ ہو۔ اداس بھی ہو تو اتنی جان لیوا نہ ہو۔

ریسٹ ہاؤس کی تازہ سُرخ بجری بچھی سڑک پر کسی کار کے گزرنے اور پھر گھوم جانے کی آواز آئی ہے۔ کار رُک گئی ہے۔ دروازے بند کرنے کی آواز ابھری ہے۔ ساتھ والے سیٹ میں کوئی آئے ہیں۔ ایک عورت اور ایک بچے کی بھی آواز ہے۔ شاید کوئی افسر ہیں، اپنی بیوی کو بھی ساتھ لائے ہیں، فیلڈ ورک کی دشواریاں دکھانے کے لیے۔ عورت کی آواز ابھرتی ہے ——

"شوفر! ادھر موسس لانا۔"

معلوم ہوتا ہے جیسے میں اس لہجے سے واقف ہوں۔ جیسے یہ

آواز میں نے کبھی سنی ہے۔ جیسے یہ میرے ماضی کے گنبد میں کہیں گونجتی ہے۔ گونجتی فضائیں تھر تھرا رہی ہیں۔

آواز دوبارہ ابھرے تو شاید پہچان پاؤں۔

"ارے یہ نہیں، دوسری والی. میری والی"

یہ پہلی آواز سے مختلف ہے۔ اس میں تندی اور تیزی ہے جس آواز کو میں پہچانتا ہوں وہ تیز اور تند نہیں۔ شانت اور گمبھیر ہے۔ تو یہ وہ آواز نہیں۔ میرا وہم ہے۔

لیکن دل میں ایک اشتیاق سا جاگ گیا ہے۔ میں پلنگ سے اٹھ کر اس بند دروازے کے پاس آگیا ہوں جو ریسٹ ہاؤس کے ان دو سیٹوں کو الگ کرتا ہے۔ کاش بند دروازے کے پیچھے سے آواز پھر اُبھرے!

"مزہ آگیا کولڈ کافی کا! تم پیو گے؟"

لہجہ پھر پہلے والا ہے۔ میرے ماضی کا گنبد لرزنے لگا ہے۔

میں دیوار کے ساتھ بیٹھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ شاید آواز پھر اُبھرے۔ لیکن پھر دوسری ہی طرح کی آواز گونجتی ہے۔ بے حد مختلف!

"ممی میں بسکٹ نہ کھاؤں گا۔ مجھے بسکٹ بالکل اچھے نہیں لگتے!"

اور پھر ایک اور آواز گونجتی ہے۔

"تم ماں بیٹا صرف نخرے کرتے ہو اور کچھ نہیں۔"

یہ آواز یقیناً اُس کار کے مالک کی تھی جس کا شوفر باہر ڈھلتی ہوئی شام کے اُجالے میں کار کے پاس کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔

میں نے تپائی سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگایا۔

اُسی وقت رام پرتاپ داخل ہوا۔

"آپ مجھے آواز دینے کو اٹھے تھے؟"

"نہیں۔"

"کچھ کام ہے سرکار؟"

"کچھ نہیں رام پرتاپ! تم جاؤ۔"

رام پرتاپ جانے کو مڑا۔ دروازے پر پردے کے قریب پہنچا تو اس نے پھر میری طرف دیکھا۔

"پتہ لگاؤ یہ کس کی کار ہے؟"

رام پرتاپ چلا گیا ہے اور میں پھر اپنے ماضی کے کھنڈروں میں منڈلاتی ہوئی آواز کا پیچھا کرنے لگا ہوں اور میری نظروں میں جے پور کی پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی دیواریں گھوم رہی ہیں جو ایک بہت بڑے وسیع اور مضبوط قلعے کی دیواریں تھیں اور جن کے ہر پتھر کے ساتھ شجاعت اور قربانی کی ایک ایک داستان وابستہ ہے۔

دیواریں ہی دیواریں ہیں میرے سامنے!

محسوس ہوتا ہے جیسے میں دیواروں سے گھرا کھڑا ہوں۔ جیسے کوئی مجھے دیواروں میں چن رہا ہے۔ دیواریں میری گردن تک پہنچ گئی ہیں۔ اب ٹھوڑی سے ذرا نیچے۔ اب ٹھوڑی تک اور وہ بڑا سا گڑھا جو میری ٹھوڑی میں کھدا ہو سا معلوم ہوتا ہے۔ کسی پتھر کی اوٹ میں دب گیا ہے۔ اب میرا نچلا ہونٹ بھی دبنے لگا ہے ——

اب —— !

رام پرتاپ پھر اندر داخل ہوا ہے۔

مجھے محسوس ہوا جیسے، جیسے بس ایک ہی پتھر اور رکھنے کی ضرورت تھی۔ مجھے کچھ بولنا چاہیے۔ نہیں تو زبان گنگ ہو جائے گی۔

"کون ہیں یہ لوگ رام پرتاپ؟"

"سرکار! جے پور کے کوئی سیٹھ ہیں۔ تھوڑی دیر ستانے کو ٹھہرے ہیں۔ ابھی چلے جائیں گے۔"

سگریٹ کا ایک بھرپور کش لے کر میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ مجھے کچلتی ہوئی دیواریں ایک بہت بھاری آواز سے ڈھہ گئیں۔ میں زندہ تھا۔

باہر کار کا بونٹ بند کرنے کا شور ابھرا تھا۔

ماضی کا گنبد ابھی تک لرز رہا ہے!

کچھ برس پہلے میں جے پور گیا تھا۔

ایسی ہی ایک شام تھی جب میں ایک پارٹی میں بیٹھا تھا۔ پارٹی

رگھوونش کے گھر بینی پارک کے ایک خوبصورت بنگلے میں ہوئی تھی۔ رگھوونش میرا دوست بھی ہے اور کزن بھی۔ پارٹی میں کئی لوگ آئے تھے۔ اُن میں ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ ارچنا! اس کے اعضا میں وہی تناسب تھا جو جے پور کی خوبصورت اور پروقار عمارتوں میں ہے۔ ایک ایک انگ جیسے تراش کر جوڑا گیا ہو۔ اس نے ایک راجستھانی گیت گایا تھا۔ گیت کے بول تو یاد نہیں۔ وہ تو ماضی کے گنبد میں کہیں سو رہے ہوں گے۔ لیکن اس گیت کی فضا مجھے اب بھی یاد ہے اور ارچنا کی آواز کا لوچ اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

میرے محبوب! تم کیسری پگڑی باندھ کر، سجی ہوئی اونٹنی پر سوار میرے پاس آجاؤ۔

میں ریت کے اڑتے ہوئے بگولوں کے پار لال گھاگھرا پہنے اور ستاروں جڑی اوڑھنی اوڑھے تمہارا انتظار کر رہی ہوں!

ریت ٹھنڈی ہو جائے گی۔ رات میں سردی گھل جائے گی اور چتردشی کا چاند ڈوب جائے گا اور میری آواز تمہارا سواگت کرنے کو دور راستوں پر بھٹکتی پھرے گی۔

تم آجاؤ میرے محبوب!،

شام کے گہرے دھندلکے میں بجلی کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے ماحول میں ارچنا راجستھانی لباس میں ملبوس سچ مچ ایک ایسی محبوبہ

معلوم ہو رہی تھی جس کا محبوب اس سے دور تھا اور جو اُسے ملنے کو بیتاب ہو رہی تھی۔

گیت گا چکنے کے بعد وہ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بہت اچھا گاتی ہیں آپ!" میں نے کہا۔

"یہ گیت مجھے بے حد پسند ہے، کیونکہ اس میں راجستھان کی ریت میں پلتی ہوئی جوان محبت کا عکس ہے۔ آزاد اور پُر وقار!"

"جو چٹان کی طرح ٹوٹنا تو جانتی ہے۔ جھکنا نہیں!"

میرے اس جواب پر ارچنا مسکرا دی تھی اور پھر رگھوونش آ گیا تھا اور اس نے ہم دونوں کا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا تھا کہ پارٹی ختم ہونے تک ارچنا اور میں بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔

میں جے پور کئی دن رہا۔ ارچنا سے ہر روز ملاقات ہوتی۔ اُس نے مجھے جے پور کی خوبصورت جگہیں دکھائیں۔ کچھ پُرانی کتھائیں بھی سُنائیں۔ چھتریاں اور محل اور مقبرے سبھی کچھ میں نے ارچنا کے ساتھ دیکھے۔ آمیر پیلیس دکھانے کے لیے جب وہ ساتھ لے گئی تو راستے میں کئی موضوع پر باتیں ہوئیں۔ جن میں ایک موضوع محبت بھی تھا۔

"پنجاب اور راجستھان کے پیار میں کیا فرق ہے؟" ارچنا نے پوچھا تھا۔

"جو پنجاب کی تند لہروں اور صحرا کے جلتے ہوئے بگولوں میں ہوتا ہے"

میں نے جواب دیا تھا۔
"اور چناب کی لہروں اور جلتے ہوئے بگولوں میں کیا فرق ہے؟"
"جو پیاس سے جلتے میرے ہونٹوں اور تمہارے ڈھلے ہوئے گیسوؤں میں ہے!"
ارچنا نے میری بات سن کر میرا ہاتھ ایک دم زور سے دبوچ لیا تھا اور کہا تھا۔
"ہونٹوں کی جلن ہی سے گیسوؤں کو نکھار ملتا ہے۔"
اور پھر جب ہم سیڑھیاں چڑھ کر آمیر پیلیس کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو ارچنا نے کہا۔
"خودکشی کے لیے اس سے بہتر جگہ بھی مل سکتی ہے کوئی؟"
"بشرطیکہ وہاں تک پہنچ سکو!"
"کہاں تک؟" اس نے پوچھا۔
اور میں نے سر اٹھا کر آکاش کی طرف اشارہ کیا جو بے حد شفّاف اور نیلا تھا، وسیع تھا اور خوبصورت تھا۔
"تم پہنچ سکتے ہو؟"
"میں پہلے ہی سے وہاں ہوں۔"
"کہاں؟"
"تمہاری آنکھوں کے آکاش میں!" میں نے جواب دیا۔
اور ارچنا ایک دم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے محلات کے

اندر کھینچ لے گئی۔ کھنڈرات اور محلات کا یہ میل بہت متضاد تھا۔
"رگھو ونش کہہ رہا تھا تمھاری شادی ہو رہی ہے"
"اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے"
تو کس کے کہنے سے ہوگی شادی؟"
"میری اپنی مرضی سے"
"اور تمہارا کیا خیال ہے؟"
"شادی ایک نہایت ہی بے ہودہ انسٹی ٹیوشن ہے"
"کیوں؟"
"اس میں انفرادیت پسندی کی کوئی گنجائش نہیں"
"انفرادیت پسندی تو کوئی بڑا تعمیری جذبہ نہیں"
"لیکن ضروری ہے"
"زندگی میں کئی اور چیزیں بھی ضروری ہیں" ارچنا نے کہا۔
"مثلاً؟"
"لمحے!"

میں ارچنا کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔
"لمحے ہی سب کچھ ہیں۔ انہی سے انسان امر ہوتا ہے اور انہی کے ہاتھوں فنا بھی۔ میں لمحوں کی پجارن ہوں۔ یہ لمحے جن میں ہم ساتھ ہیں۔ آپس میں باتیں کر رہے ہیں، تسکین پا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی قربت کی لذّت کو محسوس کر رہے ہیں۔ آنے والے سنہرے دورے

کہیں زیادہ حسین ہیں۔ جس کے ہم صرف خواب دیکھ سکتے ہیں اور ان لمحوں میں ہم زندہ ہیں۔ سانس لے رہے ہیں اور ایک دوسرے کی دھڑکنوں کو سن رہے ہیں۔" اور پھر ارچنا زور سے ہنس دی تھی۔ اس کے گالوں پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

"ارچنا!"

اپنا نام سن کر وہ چونکی

"تو تم شادی نہ کرو گی؟"

"نہیں!"

"رگھوونش سے بھی نہیں؟"

"رگھوونش سے تو بالکل ہی نہیں!"

"اور کس سے؟"

"اس سے جو شادی کے فوراً بعد میرے ساتھ بھاگ کر پہاڑ کی ان چوٹیوں پر آجائے گا اور ہاتھ پکڑ کر میرے ساتھ نیچے پھیلی خندق میں کود جائے گا! کیوں کہ یہی اس کا کلائمکس ہے!"

ارچنا نے اس دوپہر میرزا اسمٰعیل روڈ کے بہت ہی نفیس ریستوراں میں نفیس کھانا کھلایا اور بل بھی خود ہی ادا کیا تھا، کیونکہ جے پور میں وہ میری آخری دوپہر تھی اور آخری شام اور آخری رات۔

میں اور ارچنا پھر نہیں ملے۔

اِس اداس شام میں نہ جانے کیسے ارچنا مجھے یاد آگئی ہے۔ اِس

یاد کا تعلّق شاید اس آواز سے ہے جو بند دروازے کی دوسری طرف سے آئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر برآمدے میں آگیا ہوں۔ اُدھر دوسرا دروازہ بھی کھلا ہے۔ اچانک ایک حادثے کی طرح ایک راجستھانی سیٹھ باہر نکلا ہے۔ اس کے پیچھے ایک خوبصورت بچّہ ہے اور اس کے پیچھے، ہاں اُس کے پیچھے کون ہے؟ میری بھرپور نگاہیں ایک دم اٹھی ہیں۔ اس خوبصورت چہرے پہ پھیلی دو آنکھوں سے ٹکرائی ہیں۔ اس کی ساڑھی جلدی سے نکلتے ہوئے دروازے میں لگی کسی کیل سے الجھ گئی ہے اور پھر اس کی ساڑھی دور تک پھٹتی چلی گئی ہے۔ ایک تیز دھار کی طرح جو زخم میں اترتی چلی جاتی ہے اور وہ برآمدے میں بدحال تیزی سے بھاگتی ہوئی سی کار تک پہنچ گئی ہے جس کا کھلا دروازہ شوفر نے تھام رکھا ہے۔

"ارچنا! مجھے پہچانا نہیں؟ میں رگھو ونش کا بھائی ہوں!"

لیکن میری آواز صرف مجھ تک ہی محدود رہی ہے۔ کسی نے سنی نہیں۔

کار ایک دم اسٹارٹ ہو گئی ہے اور ارچنا نے خود کو سیٹ پر پھینک دیا ہے۔ وہ چلی گئی ہے اور میں اس کی کار کو سُرخ بجری والی سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ریسٹ ہاؤس کا بوڑھا چوکیدار مین گیٹ کھول رہا ہے۔

ارچنا نے شاید اِس خیال سے شادی کی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو

ساتھ لے کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے گی اور نیچے پھیلی ہوئی کھائی میں چھلانگ لگا دے گی۔ لیکن شادی کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ نہ بھاگ سکے گا، کیونکہ وہ اس کی طرح چاق وچوبند اور جوان نہیں۔ اس کی شخصیت پر اس کے نظریات کا نہیں اس کے کاروبار کا بوجھ ہے اور وہ اس بوجھ کو اتار کر خودکشی کرنے کے لیے کہیں نہیں جا سکتا۔ اس لیے وہ کلائمکس نہیں آسکا جس کی ارچنا کو چاہ تھی۔

فضا میں اندھیرا گھلنے لگا ہے۔ میں برآمدے سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا ہوں اور بستر پر گر گیا ہوں اور شام اپنے پورے بوجھ سے مجھے کچلنے لگی ہے۔ میری نظروں کے سامنے بے شمار قلعے اور محل ہیں اور کھائیاں کھنڈر ہیں اور ان سب پر ایک سوال ایک تیز رفتار پرندے کی طرح منڈلا رہا ہے۔

"ارچنا یہ تم نے کیا کیا؟"

یہ شاید میری اپنی آواز ہے۔ شاید اُن سب کے سوالوں کی آواز جو نارمل انسانوں کی طرح نہیں سوچتے۔ غلط سوچتے ہیں اور غلط فیصلے کرتے ہیں اور ان کی نظروں میں وہ سب قصوروار ہیں جو ٹھیک طرح سے سوچتے ہیں اور درست فیصلے کرتے ہیں۔

آواز میری ہے لیکن اس میں اتنا درد کیوں ہے؟

یہ صرف میرا ہی درد نہیں۔ ان سب کا ہے جو اداس شاموں میں

اپنے زخم کریدتے ہیں اور اُن میں سے نکلے ہوئے خون سے زندگی کے غیر متوازن خاکے بناتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کا نوکر آیا ہے۔" رام پرتاپ میرے سامنے کھڑا ہے اور اس کے پیچھے ڈاکٹر کا ملازم۔ لیکن میں کسی کو نہیں پہچانتا یہاں سب اجنبی ہیں، کوئی اپنا نہیں۔ میں اس پردیس میں بے خانماں ہوں، بے گھر ہوں اور تنہا ہوں۔ کیسے آگیا ہوں یہاں؟ میری آنکھیں دونوں پر ٹکی ہیں۔

"میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ میری طبیعت اچھی نہیں۔" دونوں باہر چلے گئے ہیں۔ نہ جانے آپس میں کیا کہہ رہے ہوں گے!

ڈاکٹر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کے جسم پر چتاؤں کی طرح جلتے ہوئے داغ اور بھی شدّت سے جل رہے ہوں گے۔ لیکن میرے اپنے سینے میں جو چتائیں جل رہی ہیں میں انھیں کیا کروں؟ زندگی ایک بہت بڑی چتا ہے جس میں آرزوئیں، حسرتیں اور امّیدیں کفن اوڑھے عمر بھر جوہر کی رسم ادا کرتی ہیں۔

میں پلنگ سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا ہوں۔ آکاش کے سینے پر بھی ایک چتا جلنے لگی ہے۔ سورج کی کرنیں جاتے جاتے چتا کو آگ دے گئی ہیں۔ اب نہ جانے کون کون جلے گا اس میں۔ آرزوؤں کی کتنی پدمنیاں راکھ ہو جائیں گی!

پورنیما کا چاند ابھر رہا ہے نیلے گھرے آکاش میں ۔ اداس شام کے آخری لمحے سسک رہے ہیں ۔ میں نے ایک سگریٹ اور جلالیا ہے اور کھڑکی کی سلاخوں پر اپنے گال ٹکا دیے ہیں اور میرے ذہن میں ایک چیخ گونج رہی ہے ۔ ماضی کے گنبد سے بار بار ٹکراتی ہوئی ۔

میری آواز تمہارے سواگت کے لیے دور راستوں پر بھٹکتی رہے گی ۔

تم آجاؤ میرے محبوب!!

دھوپ ـــــ ایک چادر

اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں ہوا سے بچنے کے لیے دیوار کے ساتھ چارپائی لگائے پڑی ہوں ۔ جنوری کا آخری سنیچر ہے ۔ کانونیٹ تین دن کے لیے بند ہے ۔ کوئی کام نہیں ۔ ناشتہ کرتے کے بعد میں نے ہاسٹل کے باورچی کو چھٹی دے دی ہے ۔ سب بچے اپنے گھر چلے گئے ہیں ۔ اب تین روز تک مکمل آرام ہے ۔ میں دھوپ میں تکیے میں منہ چھپائے الٹی لیٹی ہوں اور اپنے اردگرد کی اجلی مہین چادر کس کر لپیٹ لی ہے اور اس چادر میں اپنی ذات کو چھپا کر آنکھیں بند کر لینے سے کتنا سکون ملتا ہے ۔ نہ جانے ایک دم یہ کیا ہوا ؟ دھوپ کی یہ چادر اچانک کس نے اتار پھینکی ہے میرے تن کے اوپر سے ؟ ایسا محسوس ہوتا ہے میرے خواب، میری تمنائیں، میرے ارادے، میرا تصوّر ایک دم کسی نے بے لباس کر دیا ہے ۔ سب ہی کچھ ! لیکن یہ ہوا کیا ؟

ایسا محسوس ہوتا ہے کسی نے بہت زور سے دستک دی ہے ـــــ اور میرے ذہن کا بھڑا ہوا دروازہ آپ سے آپ کھل گیا ہے ؟ کتنے بدتمیز ہوتے ہیں کچھ لوگ ! کسی کی پرائیوسی کی بالکل پروا نہیں کرتے ۔

بس کھٹ سے اندر چلے آتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ ذرا بھی پسند نہیں اور بد قسمتی سے میں آج کل ویسے ہی لوگوں سے گھری ہوں، جو اپنی سہولت کے مطابق جب چاہیں آپہنچتے ہیں۔ یہ لوگ میرے محافظ ہیں۔ میرے گارڈین۔ ہر خوبصورت، جوان اور ذرا کم پروٹیکٹڈ لڑکی کے یہ محافظ آپ سے آپ بن جاتے ہیں۔ یہ عمل ہر شہر میں جاری ہے۔ اس شہر میں بھی جہاں آئے مجھے ایک سال ہو گیا ہے۔

میں شاید اپنے گھر کا محفوظ ماحول چھوڑ کر کبھی یہاں نہ آتی اور ساری زندگی اپنے ماں باپ کے گھر ہی میں گزار دیتی لیکن کچھ ایسی ہی بات ہو گئی کہ مجھے اپنا اچھا بھلا گھر اور اس گھر کے پیار کرنے والے سب لوگ چھوڑنے پڑے۔ بات تو کوئی خاص نہ تھی لیکن کبھی کبھی کسی خاص لمحے میں ایک عام سی بے ارادہ کہی گئی بات دل میں نشتر بن کر چبھ جاتی ہے اور روح لہولہان ہو جاتی ہے۔ بس ایک ایسی ہی چھوٹی سی بات ہو گئی تھی۔

جب سے خاوند سے میرا جھگڑا ہوا تھا میں اپنے ماں باپ کے گھر آگئی تھی اور اس بات کو تین برس ہو گئے تھے۔ میرا بھائی ایک پرائیویٹ فرم میں سیلز ایگزیکٹو ہے اور پتاجی وکالت کرتے ہیں۔ اپنے خاوند کے بے ہودہ تقاضوں کو پورا نہ کر سکنے کے بعد اس چھوٹے سے آسودہ کنبے میں واپس آجانا اور چین سے رہنا مجھے اچھا ہی لگا۔ میں لٹریچر کی اسٹوڈنٹ ہوں اور مجھے لکھنا پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

اس لیے گھر میں رہنا اور گھر کی دیکھ بھال کرنا ہی میرا شغل تھا پھر میرے بھائی کی شادی ہو گئی اور کچھ عرصہ میں اتنی مصروف رہی کہ مجھے اپنی کوئی بات ہی یاد نہ رہی جیسے میری کوئی ذاتی پرابلم تھی ہی نہیں پھر یہ ہوا کہ مجھے اپنا کمرہ خالی کر دینا پڑا اور میں ایک چھوٹے سے کمرے میں منتقل ہو گئی اور اپنے والد کا کمرہ بھائی اور بھابی کو دے دیا گیا۔ چنتا بہت اچھی لڑکی تھی۔ ہوم سائنس کی گریجویٹ تھی اور بہت نرم سبھاؤ کی تھی۔ ہم دونوں نند بھابی کم اور دوست زیادہ تھیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی رازدار بھی بن گئی تھیں۔ جب وہ ماں بننے والی تھی تو یہ بات بھی سب سے پہلے اس نے مجھے ہی بتائی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی سے کوئی میرے دل سے سرگوشیاں کرنے لگا ہے۔" اس نے ایک دن کہا تھا۔

"یہی بے نام سرگوشی ایک دن معصوم ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ، گلاب کی پنکھڑیوں کی خوشبو اور دوج کی پیاری چاندنی بن جائے گی چنتا!" میں نے جواب دیا تھا۔

"سچ دیدی!" یہ کہتے ہوئے چنتا نے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

اور پھر ایک دن میں نے اس پٹ پٹ ہنستی ہوئی لڑکی کو گرجتے ہوئے بھی سنا تھا۔

"لیکن ساری زندگی کون رکھ سکتا ہے اِسے اپنے گھر۔ وہ اپنے ہسبینڈ سے طلاق لے کر دوسری شادی کیوں نہیں کرلیتی!"

میں نے اس بحث کا آخری جملہ سنا تھا جو میرے بھائی اور چھنتا بھابی کے درمیان چل رہی تھی۔ اس دن تین برسوں میں پہلی بار مجھے اپنے ماں باپ کے گھر میں اپنی حقیقی حیثیت کا علم ہوا تھا۔ اس دن اتوار تھا۔ سب آرام کے موڈ میں تھے۔ بھائی میٹنی کے ٹکٹ بھی لایا ہوا تھا۔ پتا جی اپنے آفس میں اپنے ارد گرد سنڈے ایڈیشن کا انبار لگائے اخباروں کے صفحے پھڑپھڑا رہے تھے۔ کچھ اخبار میں اٹھا لائی اور سچویشنز ویکینٹ والے کالم کو دھیان سے دیکھنے لگی زندگی میں پہلی بار میں نے کسی اخبار کے اس کالم کو پڑھا تھا۔ اس لیے ذرا اوپری بھی لگ رہا تھا۔ لیکن خاصا دلچسپ سلسلہ تھا۔ اس سے اگلے دن میں نے اِس کانونیٹ میں ٹیچر کی پوسٹ کے لیے اپلائی کر دیا اور دس دن بعد یہاں چلی آئی۔ یہاں آنے کا فیصلہ میں نے اپنے ہی دل سے کیا تھا، کسی سے رائے نہیں لی تھی۔ ماں سے بھی نہیں۔ ویسے ہی جیسے میں نے تین سال پہلے اپنے ہسبینڈ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ میں اپنے فیصلے اپنے ہی آپ سے مشورہ کر کے کرتی ہوں، اور پھر اگر پچھتاتی بھی ہوں تو کسی کو اس پچھتاوے میں شامل نہیں کرتی۔ میں نے اپنے ماں باپ کا گھر ہنستے ہوئے چھوڑا تھا۔ بھائی سے وداع لی تھی۔ چھنتا کو اس کے ہونے والے

بچّوں کے لیے دعائیں دی تھیں۔ اپنے پتا کے گلے سے لگ کر مسکرائی بھی تھی۔ لیکن جب گھر چھوڑا تھا تو یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پھر وہاں نہ جاؤں گی! سکول کی چھٹیاں گزارنے کے لیے بھی نہیں!

کانوینٹ والوں نے مجھے مختصر سے ہاسٹل کا وارڈن بھی بنا دیا تھا۔ جس میں صرف بیس بچّے تھے اور سبھی چھوٹی عمر کے تھے۔ اس کے عوض مجھے رہنے کے لیے فرنشڈ کمرہ اور کھانا اور چھوٹی موٹی دوسری سہولتیں مل گئی تھیں۔ میں نے اس آفر کو قبول کر لیا تھا اور جب پہلی رات مجھے اپنا گھر چھوڑ کر اکیلے ہی اس چھوٹے سے کمرے میں سونا پڑا تو بہت دیر تک روتی رہی سوچتی رہی کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا میرا بھائی مجھے بے حد پیار کرتا تھا۔ جیتا بھی اچھی لڑکی تھی۔ ماں نے تو مجھے بڑے لاڈ سے پالا تھا۔ پتاجی نے مجھ پر سدا ہی فخر کیا تھا۔ گھر میں کوئی معمولی سی بات ہو جائے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ گھر چھوڑ دیا جائے۔ میری یہ ذہنی کشمکش کئی روز تک جاری رہی۔

یہ کشمکش نہ جانے اور بھی کتنے روز جاری رہتی اگر لکشمی سے بات نہ ہوتی!

لکشمی اس کانوینٹ میں پڑھاتی ہے اور پچھلے چار برس سے یہیں ہے۔ وہ ساؤتھ کی رہنے والی ہے اور بھری دنیا میں اکیلی ہے! اس کے ماں باپ بہن بھائی کوئی بھی نہیں۔ شادی اس نے کی نہیں اور نہ ہی ابھی شادی کرنے کا ارادہ ہے۔

"آپ تو ٹڈی ریز روڈ رہتی ہیں۔" اس نے چھٹی کے بعد میرے کمرے میں آکر کہا۔

"ہاں۔ میری فطرت ہی ایسی ہے۔"

"مجھے بھی ایسے ہی لوگ اچھے لگتے ہیں۔ زیادہ باتیں کرنے والے لوگ اعتبار کے قابل نہیں ہوتے۔"

"کیوں ؟"

"دے آر ڈی سیٹ فُل۔"

"مے بی۔" میں نے جواب دیا۔

"سکول کا مینجنگ ٹرسٹ اچھا ہے۔ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ لیکن یہ شہر بہت بے ہودہ ہے۔"

"شہر تو آج کل سارے ہی بے ہودہ ہیں۔"

"میرا مطلب لوگوں سے ہے۔ ناٹ دی سٹی اِٹ سیلف۔"

"کیسے ؟"

"خواہ مخواہ ٹکراتے ہیں کم بخت۔ کسی کو لفٹ مت دینا !"

"تھینکس فار دی ایڈوائس !" میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں نے ساتھ ہی چائے پی اور پھر لکشمی چلی گئی۔ اس نے کسی فیملی میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ وارڈن بننے سے اس نے اس لیے انکار کر دیا کہ دن رات اسے ان چھوٹے چھوٹے بچوں میں گھری رہنا پسند نہ تھا۔ لکشمی کے جانے کے بعد میں اپنی نئی زندگی کو مرتّب کرنے

لگی۔

لکشمی اس اجنبی شہر میں میری پہلی دوست بنی تھی!

مجھے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے میں تین چار روز لگ گئے۔

میں اپنی کلاس کے بچوں سے پرسنل ٹچ قائم کرنے کے لیے ہر ایک بچے کو اپنے پاس بلا کر اس سے اس کے بارے میں اور ماں باپ اور بھائی بہنوں کے بارے میں واقفیت حاصل کر رہی تھی سبھی بچے اچھے گھروں کے تھے اور بڑے ویل بی ہیوڈ تھے۔ کلاس کے آخری لڑکے اویناش کو اپنے پاس بلا کر اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر میں اکیلا ہے اور اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتا ہے۔

"کیا کرتے ہیں تمھارے ڈیڈی؟"

"بس پڑھتے رہتے ہیں۔"

"لیکن کام کیا کرتے ہیں وہ؟"

"مجھے سکول کے لیے تیار کرتے ہیں اور جب میں سکول سے گھر واپس جاتا ہوں تو مجھے کھانا کھلاتے ہیں اور پھر شام کو ہوم ورک کراتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بیٹا کچھ تو کام وہ کرتے ہوں گے۔"

میں نے پیار سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"گارڈننگ کرتے ہیں۔"

میں اس کے جواب پر ہنس دی۔ کتنا سادہ بچّہ ہے!

"تمھاری ممّی کہاں ہیں؟"

"وہ کہیں چلی گئی ہیں!"

"کہاں چلی گئی ہیں!"

"یہ میرے پاپا ہی کو معلوم ہے۔"

میں نے اوِناش کو اپنے اور قریب کر لیا اور اس کے گورے گورے ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے گلے کی طرف دیکھا۔ اس کے گلے میں ایک لاکٹ تھا۔ اُس لاکِٹ میں ایک چھوٹی سی تصویر بھی تھی۔ میں اس تصویر کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔

"یہ تصویر کس کی ہے اوِناش؟"

"میری ممّی کی۔"

"تمھاری ممّی کی!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یس میڈم!" اوِناش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس چھوٹی سی تصویر کو قریب سے دیکھنے کے لیے اوِناش کو اور اپنے پاس کر لیا۔

لاکٹ میں بند تصویر میری تصویر سے کتنی ملتی جلتی تھی! میں ایکدم سنّاٹے میں آ گئی۔ اوِناش مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟ میری ممّی اچھی نہیں لگی آپ کو؟" اوِناش نے زخمی سے معصوم لہجے میں سوال کیا۔

"ارے نہیں اوبناش! تمہاری ممّی تو بہت ہی اچھی ہیں!" میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ہیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا جیسے ایک آنسو اس کے نرم نرم بالوں میں بھی گر گیا تھا۔ میں نے اپنی ساڑی کے پلّو سے اسے پونچھ ڈالا۔

اُس رات میں بہت پریشان رہی۔

مجھے محسوس ہوا جیسے اوبناش ساری رات میری پائینتی بیٹھا رہا تھا اور اس کے لاکٹ کی تصویر لاکٹ سے نکل کر بستر پر میری جگہ لیٹ گئی تھی۔ جیسے میرے بستر پر جو عورت سو رہی تھی، وہ میں نہیں تھی۔ اوبناش کی ممّی تھی۔ میرے کانوں میں اُس کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟"

"میری ممّی اچھی نہیں لگی آپ کو؟"

مجھے رات کئی بار محسوس ہوا جیسے اوبناش آہستہ آہستہ میرے پاؤں کو ہلا رہا تھا۔ وہ ساری رات اپنے ننھے ننھے معصوم ہاتھوں سے میرے پاؤں کو ہلاتا رہا اور اس کی ممّی ساری رات میرے بستر میں سوئی رہی۔

کچھ دن گزر گئے۔

اویناش ٹائپ کیے ہوئے کچھ کاغذ لایا تھا۔ وہ کاغذ مجھے دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"آج میرا برتھ ڈے ہے"

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اویناش۔ یہ کاغذ کیسے ہیں؟"

"آج سکول کے سارے بچے ہمارے گھر چائے پئیں گے۔ یہ کارڈ آپ کے لیے ہے"

"میرے لیے؟"

"دوسری ٹیچرز کے لیے بھی ہیں میڈم!" اس نے میرے نام کا لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ایک بہت ہی خوبصورت کاغذ پر بہت ہی خوبصورت ٹائپ کی ہوئی دو تین سطریں تھیں جن میں اویناش کے پاپا نے ہمیں چائے پر بلایا تھا۔ نیچے سبز سیاہی میں اویناش کے پاپا کے دستخط تھے۔

"اپورن"

رمی سیس میں لکشمی سے بات ہوئی۔

"اویناش نے تمہیں بھی چائے پر آنے کو کہا ہے؟"

"ہاں سبھی ٹیچرز کو کہا ہے"

"جانا چاہیے؟"

"ہاں۔ اس کے گھر ضرور جانا چاہیے۔ اس نے پچھلے سال بھی ہم سب کو بلایا تھا"

"اوینا ش کے پاپا کیا کرتے ہیں؟"

"وہ جرنلدرٹ ہیں۔ لیکن لطف آجاتا ہے اس شخص سے مل کر۔ شاید وہ اِس شہر کا آدمی نہیں۔ ان سب لوگوں سے ایک دم مختلف ہے!"

"کیا مجھے جانا چاہیے اُن کے گھر؟"

"میں لے چلوں گی تمھیں۔"

ری سیس ختم ہوگئی۔ لکشمی اپنی کلاس میں چلی گئی۔

سکول کے بعد میں اُس مختصر سے کارڈ کو بار بار دیکھتی رہی۔ اس کا اپنا نام اپورن تھا۔ نامکمل، تشنہ، ٹوٹا ہوا۔ ان فل فیلڈ۔ شاید اسی لیے اُس نے اپنے لڑکے کا نام اوینا ش رکھا تھا۔ لافانی، مکمل، فل فلمنٹ کا یہ پروسیس وہ اوینا ش کی ماں کے بغیر کیسے کمپلیٹ کرنا چاہتا تھا؟ یہ بات میرے ذہن میں گڑ کر رہ گئی۔

شام کو سکول کے گیٹ پر پانچ کاریں کھڑی تھیں بچوں کو لے جانے کے لیے۔ ایک گاڑی میں اوینا ش تھا۔ لکشمی بھی آگئی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"اوینا ش کے پاپا نے بچّوں کو لے جانے کے لیے پچھلے برس بھی اسی طرح گاڑیاں بھیجی تھیں۔ جو بچے اپنے اپنے گھروں سے نہ آسکتے تھے انھیں بھی اسی طرح اِکٹھا کیا تھا۔ ہی از اے گریٹ مین۔"

"تم تو بڑی ایڈ مائر وہو مسٹر اپورن کی!"

"تم بھی ہو جاؤ گی!"

ہاسٹل کے بچے گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ لکشمی اور میں ادیناش کے ساتھ پانچویں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ادیناش میری گود میں بیٹھ گیا اور میری نگاہیں اس کے لاکٹ پر جم گئیں۔

جب ہم ادیناش کے گھر پہنچے تو اس کے پاپا گیٹ پر کھڑے تھے اور بہت سے بچے پہلے ہی آ چکے تھے۔ جب ادیناش میری انگلی پکڑے مجھے گیٹ کی طرف لایا تو میں نے دیکھا ایورن ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر یوں جمی تھیں جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"پاپا، میری میڈم مس رتنا!" ادیناش نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ لیکن وہ مجھے اسی طرح دیکھے جا رہا تھا۔

"آپ!" وہ بولا۔

"میرا نام رتنا وششٹ ہے۔" میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔

لکشمی بچوں کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اسی لمحہ دوسری ٹیچر زبھی آ گئیں اور میں بھی ادیناش کی انگلی پکڑے اندر چلی گئی۔

پھر ادیناش مجھے اکیلی چھوڑ کر بچوں میں شامل ہو گیا۔

جب برتھ ڈے کیک کٹ چکا تو مسٹر ایورن ایک ایک بچے کے پاس کھڑے ہو کر اسے پیار سے کھلاتے رہے اور لان کے ایک کونے میں میوزک کے ریکارڈ ہلکے ہلکے بجتے رہے۔ میں لکشمی کے ساتھ ایک طرف

کھڑی اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنے انہماک سے بچوں کو سرو کر رہا تھا۔ اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ اُس نے ایک درجن ٹیچرز کو بھی بلا رکھا ہے اور وہ الگ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹی کھڑی ہیں اور اسے ان کا دھیان ہی نہیں۔

"پچھلے برس بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہم سب کھڑی رہیں اور مسٹر ایورن بچوں کو کھلانے میں مصروف رہے۔ مسز تلواڑ تو ناراض ہو کر چلی بھی گئیں۔" لکشمی کومینٹ کر رہی تھی۔

"مسز تلواڑ کون؟"

"جس کی جگہ تم آئی ہو۔ وہ سروس چھوڑ گئی تھی۔"

میری نظریں مسٹر ایورن کا تعاقب کرتی رہیں اور لکشمی باتیں کرتی رہی اور میوزک کی دھنیں گونجتی رہیں۔ پھر میں نے دیکھا وہ بیرول کو ساتھ لیے ہماری طرف آ رہا تھا۔ ایک ایک ٹیچر کے پاس جا کر اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور اسے کھانے کی چیزیں پیش کر رہا تھا۔ پھر وہ میری اور لکشمی کی طرف آیا اور میرے پاس پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔

"یہ ہماری نئی کلیگ ہیں۔ مسز تلواڑ کے بعد انھوں نے کانونٹ جوائن کیا تھا۔" لکشمی کہے جا رہی تھی اور وہ میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے خود ہی بیرے کی ٹرے سے پلیٹ اٹھالی تھی۔

"آپ بھی لیجیے!" میں نے ایک پلیٹ اس کے آگے بھی کر دی۔

اس نے انکار نہیں کیا۔ پلیٹ لے لی۔

"اوبناش آپ کی بہت تعریف کرتا ہے۔"

"وہ بہت ہی پیارا بچہ ہے!" میں نے کہا۔

"لیکن بہت اِنوسینٹ ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے بیرے کی ٹرے سے کھانے کی ایک آدھ چیز اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا، تمہارے پاپا کیا کام کرتے ہیں، کہنے لگا، گارڈننگ کرتے ہیں۔"

میری بات سُن کر لکشمی زور سے ہنسی اور اس کے ساتھ ہی بھی اور پھر وہ بھی۔ لیکن وہ سب سے آخر میں ہنسا تھا۔ جیسے اسے ہنسنے کی عادت نہ تھی۔

اتنے میں اوبناش اُدھر آگیا۔

"بیٹا! میڈم کو اپنا سٹڈی روم نہ دکھاؤ گے؟"

"آیئے میڈم میرے ساتھ!" وہ چلنے لگا تو مسٹر اپورن نے اسے روک لیا۔

"ٹھہرو! بوٹ کے تسمے کھل گئے ہیں۔" وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اوبناش کے بوٹ کے تسمے باندھ دیے اور کہا۔

"اب جاؤ۔"

اوبناش اُنگلی پکڑے مجھے اندر لے گیا اور مسٹر اپورن لکشمی سے باتیں کرتا رہا۔ کتنا سینٹی مینٹل آدمی تھا وہ!

اویناش کا سٹڈی روم بالکل میرے کمرے جتنا تھا چھوٹا سا میز، میز کے ساتھ چھوٹی سی کرسی۔ اِدھر اُدھر ترتیب سے پڑے ڈھیروں کھلونے اور سامنے کی دیوار کے اوپر اس کی ممّی کی تصویر۔ وہی تصویر اس کے لاکٹ میں تھی۔

وہ ایک دم میری تصویر تھی!

"میڈم! آپ کی شکل میری ممّی سے بہت زیادہ ملتی ہے نا؟"

"ہاں بیٹا" میں نے سر ہلایا اور اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

"کہاں گئی ہیں تمھاری ممّی؟"

"پاپا کہتے ہیں وہ ناراض ہو کر ہمیں چھوڑ گئی ہیں۔"

"کیوں ناراض ہوئی تھیں؟"

"پاپا سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ آپ تو مجھ سے ناراض نہ ہوں گی نا میڈم؟"

"نہیں بیٹا!"

میں زیادہ دیر اس کمرے میں نہ رک سکی اور فوراً باہر چلی آئی۔

میں نے دیکھا مسٹر اپورن پھر بچوں کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور ایک ایک کو بہت پیار سے کھلا رہا تھا کسی کے منہ میں رس گلّا ڈال رہا ہے تو کسی کے ہاتھ میں برفی کا ٹکڑا تھما رہا ہے۔ کتنا عجیب شخص تھا! لمحہ بھر میں اویناش بھی اسی گروہ میں شامل ہو گیا۔ لاکشمی اب دوسری ٹیچرز کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔

میں چپ چاپ گیٹ سے باہر نکل آئی ۔

اور پھر وہی ہوا جیسا کہ لکشمی نے مجھ سے کہا تھا۔
لوگ مجھ سے ملنے آنے لگے۔ کوئی کسی بچے کے باپ کی حیثیت سے مجھ سے ملنے آتا۔ کوئی میری کسی کلیگ کے ہسبینڈ کے ناطے سے مجھ سے کھلنے کی کوشش کرتا۔ کوئی میری کسی ٹیچر کا بھائی بن کر آتا اور میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتا۔ کوئی ڈنر اور لنچ آفر کرتا۔ کوئی پکچر کے ٹکٹ لے کر آتا۔ کسی کو میرے کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر کو دیکھنے یا اسے ریپیر کرانے کی فکر تھی۔ کسی کو میرے گلے کی فکر تھی جو اکثر خراب رہتا تھا۔ میرے اردگرد میرے محافظوں کا جمگھٹا بڑھنے لگا۔ میں بیچ بیچ میں لکشمی کو ان سب کے بارے میں بتاتی رہتی اور وہ کہتی کہ اس کے اپنے تجربے میں بھی تقریباً یہی لوگ اور اسی قسم کے آفرز آئے تھے اور اس نے انھیں کی بنا پر مجھے وارن کیا تھا۔

لیکن اگر کبھی کوئی مجھ سے ملنے نہ آیا تو وہ مسٹر اپورن تھا۔ اوبناش کا پاپا۔ وہ شاید اپنے آپ ہی میں اتنا مصروف تھا کہ اسے کسی کا گارڈین بننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

ایک دن مجھے اُس کے گھر جانا پڑا۔ اوبناش اچانک بیمار ہوگیا تھا اور اس نے مجھے بلوا بھیجا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار

یارا اس کے گلے میں چمکتا ہوا لاکٹ گھومتا رہا اور میں انکار نہ کرسکی۔
میں جب اس کے گھر گئی تو مسٹر ایورن اس کے سرہانے بیٹھا
اس کا سر دبا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔
"بہت تیز بخار ہے اوینا شی کو!"
مسٹر ایورن کا چہرہ اترا ہوا تھا اور ہونٹ خشک اور بال
بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر دھچکا سا لگا۔ میں اوینا شی کی پائینتی
میں بیٹھ گئی۔

"اوینا شی نے دن میں کئی بار پکارا۔ آئی ایم سوری، میں نے
آپ کو تکلیف دی!" مسٹر ایورن کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔
کچھ ہی دن پہلے کی پرتھ ڈے پارٹی والے مسٹر ایورن میں اور
اس لمحہ نظر آتے ہوئے ایورن میں کتنا فرق تھا! یہ لمحوں لمحوں کا فرق
کتنی کڑوی حقیقت بن جاتا ہے کبھی کبھی۔
"میں دباتی ہوں اوینا شی کا سر۔ آپ اٹھ جائیے!"
وہ چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میں اس جگہ بیٹھ کر اوینا شی
کا سر دبانے لگی۔

ایورن اور اوینا شی!
فل فلمنٹ کا ایک طویل پروسس!
نوکر چائے لے کر آیا۔
"نہیں اب دل نہیں چاہ رہا ہے۔" مسٹر ایورن نے اسے واپس

کر دیا۔

"نہیں چھوڑ جاؤ چائے"، میں نے کہا۔

نوکر پاس رکھی ہوئی تپائی پہ چائے کا سامان رکھ کر چلا گیا۔ میں نے چائے کی پیالی بنا کر مسٹر ایورن کو آفر کی۔ اس نے انکار نہیں کیا۔

"آپ نہیں لیں گی چائے؟"

"میں چائے نہیں پیتی۔"

میرا جواب سُن کر اس نے میرے چائے نہ پینے کی وجہ نہیں پوچھی۔ چائے پینے کے لیے اصرار بھی نہیں کیا۔ آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا اور اپنے بالوں کو سنبھالتا رہا جو اس کے چہرے پر گرتے آ رہے تھے۔

"ادیناش بیٹا! میں ہوں تمھاری رتنا میڈم!" میں نے اس کے چہرے پر جھک کر آہستہ سے کہا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ادیناش نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"تھینک یو میڈم!" وہ آہستہ سے بولا اور پھر اُس نے اپنا چہرہ میرے بہت ہی قریب کر لیا۔ ایک دم قریب! میری ران سے مس کرتا ہوا۔

اور پھر میں چلی آئی۔

کانوینٹ تین روز کے لیے بند تھا۔ لکشمی مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ ادیناش بیمار تھا۔ اسے میری

ضرورت تھی۔ اس کے گلے میں پڑا لاکٹ جیسے ایک بیڑی بن کر میرے
پاؤں میں چھونے لگا تھا۔

میں دھوپ میں دیوار کے ساتھ لیٹی تھی اور دھوپ کی اجلی چادر
تان کر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اب شام کو اوینا ش کو دیکھنے
جاؤں گی۔

جبھی مجھے محسوس ہوا! جیسے میرے جسم کے گرد لپٹی دھوپ کی اجلی
چادر کسی نے ایک دم کھینچ کر اتار دی ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے دو ننھے
ننھے ہاتھ میرے پاؤں کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے۔

"رتنا میڈم اٹھو نا۔ میرا بخار پھر تیز ہو گیا ہے۔"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی ہوں۔

کوئی باہر کے آہنی گیٹ کا پیچ اٹھا رہا ہے۔ آواز جو آئی ہے!!

زخم اور خوشبو

اگر رچنا اسکول سے جلدی گھر نہ آجاتی اور کال بیل کی آواز سن کر مجھے اس کے لیے دروازہ نہ کھولنا ہوتا تو میں جانے کتنے لمحے، کتنے سال، کتنی صدیاں اور اسی طرح بستر میں پڑی رہتی۔ ایک دم نڈھال اور ادھ مری سی۔ رچنا نے گھر آکر مجھے مرنے سے بچا لیا ہے اور میرے ذہن پر چھائی ہوئی زخموں کی گھٹن کو ایک تازہ خشک اور نرم ہوا کا جھونکا مل گیا ہے۔

میں بچ گئی ہوں۔

ورنہ مرا ہوا آدمی دوبارہ کہاں زندہ ہوتا ہے!

کہاں ہوتا ہے وہ زندہ۔؟

اور زندہ ہونے کے بعد پہلا احساس جو مجھے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی شرافت اور ایمانداری بھی کسی کے لیے کتنی مہلک اور جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے!

تم جو بڑے صاحب کے پرانے دوست ہو لیکن میرے نزدیک آئے تمھیں مشکل سے اڑھائی تین سال ہی ہوئے ہیں۔

میں تم سے پہلی بار چنڈی گڑھ میں ملی تھی جہاں چوپڑہ صاحب اپنے کاروبار کے سلسلہ میں گئے تھے۔ رچنا نے اسکول سے اتوار کے ساتھ ایک چھٹی اور لے لی تھی اور وہ بھی اِس سٹی دی بیوٹی فل کو دیکھنے میرے ساتھ چل پڑی تھی۔ فروری کا مہینہ تھا موسم خوشگوار تھا اور اتنی لمبی ڈرائیونگ کے بعد بھی چوپڑہ صاحب تھکے نہیں تھے۔ رچنا چائے پی کر تمھارے پھولوں کی کیاریوں میں گھومنے لگ گئی تھی اور تم اور میں اور چوپڑہ صاحب باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

" یہ میرا بہت پرانا دوست ہے لیکن شرافت اور اخلاق کا مارا ہوا۔" چوپڑہ صاحب نے تمھارا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔

" تو اس میں کیا بُرائی ہے۔؟"

" لو تمھاری ایک طرف دار اور نکل آئی ہے۔"

" اقلیتوں کی طرف داری سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔" تم نے کہا تھا۔

" فائدہ بھلے ہی نہ ہو لیکن اقلیتوں کو اپنے تحفظ کا احساس تو ہوتا ہے۔"

" اسی تحفظ کے احساس نے ہندوستانی عورت کو گھر کی دیواروں کا غلام بنا رکھا ہے۔ نہ یہ احساس ختم ہوگا نہ اس کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں گی۔" چوپڑہ صاحب نے میری بات کو کاٹا تھا۔

تم صرف ہنسے ہی تھے۔ صرف بے کاری سی بے مصرف ہنسی۔ اقلیتوں

کی کمزور آواز کی طرح۔

اسی لمحہ رچنا گلاب کی ایک ادھ کھلی کلی توڑ کر لے آئی تھی اور میرے جوڑے میں لگانے لگی تھی میں نے دیکھا اس کی انگلی میں ایک تیز سا کانٹا چبھ گیا تھا اور انگلی کی سطح پر سُرخ خون کی ایک بوند سُرخ مونگے کی طرح جم گئی تھی۔

"کانٹا چبھو لیا نا انگلی میں!" میں نے رچنا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرئیے!" یہ کہہ کر تم کوٹھی کے اندر لپکے اور پل بھر میں یوڈی کلون کی شیشی اور روئی کا ٹکڑا اٹھا لائے اور کلون سے بھگو کر روئی کا پھاہا رچنا کی انگلی پر چمکتے ہوئے خون کی بوند پر رکھ دیا اور دین سابر یوڈی کلون کی ہلکی ہلکی خوشبو کی لہریں بڑی معصومیت سے ادھر ادھر پھیل گئیں۔

"اس کے پاس تو ہر گھاؤ کا علاج یوڈی کلون ہی ہے" یہ سمجھتا ہے کہ ہر زخم اس سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

اور اس شام جب چوپڑہ صاحب کسی سے ملنے چلے گئے اور مجھے اور رچنا کو گھر چھوڑ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کی بات ٹھیک تھی۔ دین سابر یوڈی کلون کی خوشبو ہر زخم کا علاج نہیں ہے۔

تم اتنی بڑی کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے۔ تمہاری بیوی کا انتقال ہوئے کئی برس ہو چکے تھے اور گو تم تمہارا ایک ہی لڑکا تھا جو ستاور اسکول میں پڑھتا تھا اور سال میں دو بار چھنڈی گڑھ آتا تھا۔ جب

اسکول میں چھٹیاں ہو جاتی تھیں لیکن تم دوسرے تیسرے مہینے اس سے ضرور مل آتے تھے۔ تمہارے گھر کی دیکھ بھال کرنے والا تمہارا ایک بوڑھا ملازم گوری تھا جو کلو کا رہنے والا تھا اور اس کے چہرے پر پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کی مخصوص سادگی اور مظلومیت جھلکتی تھی وہ کئی برسوں سے تمہارے ساتھ تھا اور تمہاری بیوی انو اسے لائی تھی اور بقول تمہارے گوری کی عمر اور صحت پر وقت کے بہاؤ نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ گوری اس گرے نا یئرٹ کی چٹان کی طرح تھا جسے ندی کے بہاؤ نے کسی بھی طرح متاثر نہ کیا تھا، صرف اتنا ہوا تھا کہ چٹان پر کہیں کائی کی مہین تہہ تک نہ جم پائی تھی اور اس کی سطح پہلے ہی کی طرح شفاف تھی۔ کردار کا یہی شفاف پن گوری کے چہرے اور شخصیت میں رچ گیا تھا۔ جب تک انو زندہ رہی گوری گھر کی دیکھ بھال کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاتا رہا لیکن اس کے پرلوک سدھارنے کے بعد وہ ایک دم اکیلا ہو گیا تھا اور گھر کے ساتھ ساتھ اسے تمہاری بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔ انو تو بس دیوار دل پر لگی اپنی تصویروں ہی سے گھر کی نگرانی کرتی تھی اور اپنی مسکراہٹوں کے مختلف زاویوں سے گوری کو حوصلہ دیتی تھی اور رات کے خاموش لمحوں میں جب ہر طرف اندھیرا چھایا ہوتا تھا وہ دیواروں کی اونچائیوں سے اتر کر اور شیشے کے خوبصورت فریموں سے باہر نکل کر سارے گھر میں گھومتی تھی اور اپنی خوبصورت مخروطی انگلیوں سے ان سب چیزوں کو صاف کرتی تھی جن پر لمحوں کی گرد ڈھیرے ڈھیرے

جم جایا کرتی تھی اور کمروں کے دروازوں پر اس کی ساڑی کا رنگ دار آنچل لہراتا تھا اور گھر کے دھو دھو کر صاف کیے گئے فرش پر اس کے پاؤں کے نشان جم جاتے تھے جنھیں سورج کی پہلی کرنیں اپنے نرم ہاتھوں سے دھیرے دھیرے مٹا دیتی تھیں۔

اور سونے سے پہلے گوری سب کمروں میں یوڈی کلون چھڑکتا تھا اور گھر کے کمروں کے تمام دروازے سوائے باہر والے مین دروازے کے کھول دیتا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اپنے کمرے میں دونوں پلنگوں پر خود بستر بچھاتے تھے اور خود ہی وین سا یر یوڈی کلون چھڑکتے تھے اور انو کی تصویر کو گئی رات تک نہارتے ہوئے سو جاتے تھے۔ صبح جب جاگتے تھے تو گوری تمہارے لیے چائے لاتے وقت دو پیالیاں لاتا تھا اور دو چمچ ٹرے میں رکھتا تھا اور پھر تم خود ہی اور پنج پیکو کی دو پیالیاں بناتے تھے اور ساتھ ساتھ اپنے روزمرہ کے پروگرام کے مطابق اخبار بھی پڑھتے تھے۔ شیو بھی بناتے تھے۔ الماری سے پہننے کے لیے کپڑے بھی نکالتے تھے اور جب تک تم تیار ہو پاتے تھے چائے کی دوسری پیالی ٹھنڈی ہوتی رہتی تھی اور جب وہ ایک دم سرد ہو جاتی تھی تو اسے منی پلانٹ کے بڑے سے گھراؤ میں انڈیل دیتے تھے۔ چائے میں تم شکر اس لیے نہیں ڈالتے تھے کہ انو چائے میں شکر نہیں ڈالا کرتی تھی۔

چوپڑہ صاحب کے جانے کے بعد تم بڑی ملائمیت، اخلاق اور شرافت سے باتیں کرتے رہے۔ رچنا سے اس کے اسکول کے بارے

میں پوچھتے رہے اور میں ڈھیر سارے البم دیکھتی رہی جو انو کی تصویروں سے بھرے پڑے تھے اور پھر اس کمرے میں چلی گئی جو گیسٹ روم نہیں تھا لیکن اس سے بہتر تھا تم نے ہمیں گیسٹ روم میں اس لیے نہیں ٹھہرایا تھا کہ چوپڑہ صاحب تمھارے مہمان نہیں تھے۔ تمہارے بہت ہی عزیز اور پرانے دوست تھے۔

جب کوئی تین گھنٹوں کے بعد چوپڑہ صاحب واپس آئے تو میں سو رہی تھی اور رچنا راننے میں خریدی گومک بک پڑھتے پڑھتے میری کمر کی ڈھلان میں اونگھ گئی تھی اور باہر اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا اور تم گھر میں نہیں تھے۔

مجھے جگانے کے بعد چوپڑہ صاحب نے کہا۔

"بڑا ہی عجیب آدمی ہے۔ ہر روز اپنے بڑے بھائی کو خط لکھتا ہے جس میں ایک سطر کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور پھر خود ہی اسے آخری کلیرنیس کے وقت ڈاکخانے میں پوسٹ کرنے جاتا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا میں تو پہلے ہی ذہنی طور پر بڑی غیر متوازن ہو رہی تھی۔

"کم بخت نوکر کو بھی تو نہیں بھیجتا خط پوسٹ کرنے کو۔ حیرت ہے کہ اپنا کاروبار کیسے سنبھالتا ہے یہ شخص"؟

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ تم آئے۔ تمہارے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی تھی۔

"وکھول آئے جن لوگوں سے تمھیں ملنا تھا؟" تم نے چوپڑہ صاحب سے پوچھا۔

"ہاں!"

"تو اب کیا پروگرام ہے؟"

"وِسکی و سوڈا پلاؤ" چوپڑہ صاحب نے کہا۔

"لیکن میرا تو آج منگل ہے۔"

"میرا تو منگل نہیں۔"

"آپ کا تو ہمیشہ ہی اتوار رہتا ہے۔" میں نے ہلکا سا طنز کیا۔

"اتوار تو بالکل چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ اس روز تو خدا بھی آرام کرتا ہے۔" تم نے کہا۔

"اور تم؟"

"میں بھی آرام ہی کرتا ہوں۔"

"صرف کمرے صاف کرتے ہو۔ کتابوں کے شیف جھاڑتے ہو۔ الّو کی تصویروں کے اینگلز بدلتے ہو۔"

"نہیں شام کو وِسکی بھی پیتا ہوں۔"

"لیکن اکیلے۔"

"ارے نہیں چوپڑہ۔ میں تو کبھی بھی اکیلے نہیں پیتا۔"

"کون ہوتا ہے تمھارے ساتھ۔!"

میں دونوں کی گفتگو کو بڑے دھیان سے سُن رہی تھی لیکن

خاموش تھی - اپنی طرف سے کوئی کومینٹ نہ کیا تھا۔
"ایک بھرپور محفل"۔ تمھارے اس جواب نے مجھے چونکا سا دیا
"کون سی محفل"۔ چوپڑہ صاحب زور سے ہنسے۔
"یادوں اور لمحوں کی بھرپور مجلس۔ راگ رنگ، قہقہے، آنسو،
سبھی تو ہوتے ہیں میرے ساتھ!"
تم نے میری طرف دیکھا۔ جانے کیا تھا تمہاری نظروں میں کہ
میں لرز گئی۔
"اگر یہی حال رہا تو تمھارے پاگل ہونے میں زیادہ دیر نہیں
لگے گی"، چوپڑہ صاحب بولے۔
پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔
اور جب دو دن کے بعد ہم دونوں دہلی واپس پہنچے تو مجھے لگتا
تھا کہ تم تو جانے کب پاگل ہو گئے لیکن مجھے تم نے ضرور پاگل کر دیا
تھا۔

اس دوران میں تم جب بھی دہلی آئے ہمیں ملنے ضرور آئے۔
چوپڑہ صاحب ہر بار تمھیں کہتے کہ ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے گھر میں
ٹھہرو لیکن تم اپنی ضد پر اڑے رہے اور ہوٹل میں ٹھہرتے رہے۔
ایک بار چوپڑہ صاحب کے بہت ٹوکنے پر تم نے جواب دیا۔
"ہوٹل میں ٹھہرنے سے میری آزادی ختم نہیں ہوتی"۔
"گھر میں کون بیڑیاں ڈالتا ہے تمہارے پاؤں میں"۔

"میں جانتا ہوں تم بیڑیاں نہیں ڈالو گے لیکن مجھے خود ہی اپنے پاؤں میں زنجیریں ڈالنا پڑیں گی۔ خود اختیار کی ہوئی بیڑیاں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں چوپڑہ۔" میں نے تمہاری آواز کے لہجے کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس میں رچے ہوئے درد کو بھی محسوس کیا۔

اور آج صبح کوئی نو بجے کے قریب فلیٹ کی کال بیل گونجی۔ رچنا اسکول جانے کو تیار تھی۔ دروازہ اسی نے کھولا۔

"ممی انکل آئے ہیں۔"

میں لپک کر دروازہ پر آئی۔ سامنے تم کھڑے تھے۔ مجھے اس روز پہلی بار میلے کچیلے پن سے یہ احساس ہوا کہ عورت کو ہر حالت میں صبح سویرے تیار ہو جانا چاہیے ورنہ ایک ہاؤس وائف تو اس قابل نہیں ہوتی کہ صبح سویرے کوئی اجنبی اسے دیکھے۔

"نمشکار"! تم نے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں تمہارا ایرکیس تمہارے ہاتھ سے لے کر اندر رکھنے لگی تو تم نے ٹوکا نہیں۔ صرف اتنا بولے۔

"میں نے سوچا آج چوپڑہ کو سرپرائز دوں۔ جہاز سے اترتے ہی ادھر آگیا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے۔"

"چوپڑہ سویا پڑا ہے کیا؟"

یہ کہتے ہوئے تم اندر آ گئے۔

"وہ تو کل لکھنؤ چلے گئے۔ انھیں اچانک ہی جانا پڑا۔"

"یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔"

تم نروس ہو گئے تھے۔ میں تمھیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"کیا گڑبڑ ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

اب تو میں یہاں نہیں رہ سکوں گا۔"

"کیوں نہیں رہ سکیں گے؟"

"گھر کے مالک کی غیر حاضری میں کسی غیر کا گھر میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

"تو آپ اپنے آپ کو غیر ہی سمجھتے ہیں ابھی تک؟"

"غیر تو میں اپنے آپ کو اپنے گھر میں بھی سمجھتا ہوں۔"

"لیکن وہاں تو آپ بیڑیاں نہیں ڈالتے اپنے پاؤں میں؟"

"وہاں بھی ڈالتا ہوں۔" تم نے بڑی متانت سے کہا۔

"تو یہاں بھی ڈال لیجیے ایک دن میں بھی سنوں گی بیڑیوں کے کھنکنے کی آواز۔"

یہ بیڑیاں کھنکتی نہیں آگ میں تپتی ہیں چیتراجی۔"

تمہارے منہ سے اپنا نام سن کر پل بھر کو میری نظریں تمہارے چہرے پہ جم گئیں۔

اس سے پہلے بھی تو تم کئی بار گھر آ چکے تھے۔ کھانے یا چائے

کے لیے رُکے بھی تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہی تھیں لیکن تم نے کبھی مجھے میرا نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ تم نے آج کیوں ایسا کیا تھا؟ آج تم نے میرا نام کیوں لیا تھا؟"

یہ تمھاری بیڑی کی کون سی کڑی کھنکتی تھی۔

مجھے لگا جیسے میرے ذہن میں کئی بیڑیاں بج رہی تھیں۔

"ممی میں جا رہی ہوں" رچنا وہیں دروازے سے یہ اطلاع دے کر نکل گئی۔ میں چونکی۔ مجھے لگا جیسے میں تمھارے سامنے کھڑی تمھیں دیکھ رہی تھی۔ تم نے نظریں جھکا لیں۔

"بدھو!!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

تم حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"دروازہ بھی کھلا چھوڑ گئی ہے۔" میں نے بات کا پہلو اس انداز سے بدلا جس انداز سے پکڑے جانے پر ہم عورتیں بدل لیتی ہیں۔

تم خاموش رہے۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے!" میں نے پوچھا۔

"نہیں، چائے تو جہاز ہی میں پی لی تھی۔"

"تو کچھ ٹھنڈا لیجیے۔"

"سرد چیزیں مجھے پسند نہیں۔"

"تو کیا پسند ہے آپ کو؟"

"میری عمر چالیس سال سے اوپر ہو چکی ہے اور ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ مجھے کیا پسند ہے۔؟"

"آپ (Sadist) ہیں" میں نے کھینچ کر کہا۔

"شاید"

"نہیں میسوکسٹ Masochist ہیں"

"ہو سکتا ہے"

"سبھی کچھ ہو سکتا ہے؟" میں نے طنزاً کہا۔

"لیکن سبھی کچھ کہاں ہوتا ہے۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہم سب کتنے مجبور اور بے بس ہیں"

میں نے محسوس کیا تمہارے اندر کتنا گہرا درد تھا جو چھپانے کے لاکھ جتن کرنے پر بھی ادھر ادھر سے عیاں ہو ہی جاتا تھا۔

"اپنے حالات کے مطابق سبھی مجبور ہیں۔ لیکن سب لوگ اپنی مجبوریوں کی نمائش نہیں کرتے۔ ان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں"

"شاید آپ ہی کی بات صحیح ہے"

پھر تم خاموش ہو گئے۔ لمحہ بھر کے بعد بولے۔

"پانی پلائیگا ایک گلاس؟"

میں فرج سے ٹھنڈا پانی لے کر آئی تو تم اپنا ایرکیس کھول رہے تھے۔

"ذرا ہاتھ منہ دھو لوں"

"پانی تو پی لیجیے"

تم نے بغیر کچھ کہے میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا۔ اور ایک ہی گھونٹ لے کر رکھ دیا۔

"ٹھنڈا نہیں ہے کیا؟"

"بہت ٹھنڈا ہے"

"تھوڑا تازہ پانی ملا دوں اس میں؟"

"نہیں" یہ کہتے ہوئے تم باتھ روم کی طرف بڑھے۔

"صابن تولیہ تو رکھ لینے دیجیے"

"ہے میرے پاس"

اور تم ایک چھوٹا سا چمڑے کا بیگ لیے باتھ روم میں گھس گئے۔

میں ایک دم الجھی ہوئی تھی۔ پل بھر کو کمرے میں جا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بالوں کو سنورا، گیلے تولیے سے منہ صاف کیا۔ واش بیسن میں دانت صاف کیے۔ ساڑھی کی سلوٹیں ٹھیک کیں اور پھر گیس پر چائے کا پانی رکھ دیا اور جلدی سے دو ٹوسٹ بھی سینک دیے۔ کام بھی کر رہی تھی اور سوچ بھی رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ذہن میں کہیں کوئی گانٹھ پڑ گئی تھی۔ دماغ تنا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں تم باتھ روم سے نکل آئے۔ لگا جیسے یوڈی

کلون کا بھرپور طوفان کمروں میں بھر گیا۔

اور مجھے پہلی ملاقات کے دن چوپڑہ صاحب کے تم سے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔ جب تم نے رچنا کی انگلی پر دین سابر یوڈی کلون کا پھاہا رکھا تھا۔

اس کے پاس تو ہر زخم کا علاج یوڈی کلون ہی ہے۔

"کون سا تازہ زخم کھایا ہے تم نے؟" یہ الفاظ میری زبان پر آ کر رُک گئے۔ ورنہ غضب ہو جاتا۔

میں نے سوچا کچھ اور تھا لیکن کہا کچھ اور۔ وہی چیلنج جو کچھ دیر پہلے کر چکی تھی دوہرا رہی تھی۔

"کرتم کیسا ہے؟"

"وہ تو تردان بھی پرایت کر چکا۔"

تمھارا جواب سن کر مجھے محسوس ہوا کہ تمھاری ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ کوئی تمھارے زخم کو نہ چھو سکے۔ یا تم زخم کا رخ بدل دیتے تھے یا اسے چھونے والے ہاتھ کو دوسری طرف کر دیتے تھے۔ اپنے آپ سے ہائیڈ اینڈ سیک کا عمل کرتے کرتے ایک دن ایسا آ جائے گا جب تمھارے پاس زخم ہی زخم رہ جائیں گے خون اگلتے ہوئے ان گنت زخم لیکن انھیں چھونے والا کوئی ہاتھ نہ ہوگا۔ کسی آنچل کا چھور نہ ہوگا۔ کسی زلف کی چھاؤں نہ ہوگی اور کسی یوڈی کلون کی خوشبو کا نرم غلاف

نہ ہوگا۔

"سنا ورا اسکول میں کب چھٹیاں ہوتی ہیں؟"

"وہ تو اب دسمبر میں ہوں گی۔"

"گوتم سے کب ملے تھے آپ؟"

"ابھی پچھلے ہفتہ اس سے ملنے گیا تھا۔"

"آپ تو نروان کی بات کر رہے تھے۔"

"وہ تو بدھ کے بارے میں تھا۔" تم مسکرائے۔

"بدّھو کے بارے میں تو نہیں؟" میں نے طنز بھری نظروں سے تمھیں دیکھا۔

"وہ تو دروازہ بھی کھلا چھوڑ گئی ہے۔"

تمھارا جواب سُن کر میں اتنے زور سے ہنسی کہ تم حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"ٹوٹی ہوئی بیڑیوں کی آواز ایسی ہی ہوتی ہے۔" تم بولے

"وشال!" میں چیخی۔

تم ابھی تک کھڑے تھے میں بھی کھڑی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ہمارے درمیان یوڈی کلون خوشبو کی باریک سی دیوار حائل تھی جس کے روزنوں میں سے دیکھتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں وشال نہیں ہوں۔ میری شخصیت کی وسعتیں تو کب کی ختم ہو چکیں۔ میں تو ایک قیدی ہوں۔ ایک جکڑا ہوا انسان۔"
"اس طرح تو میں بھی جیترا نہیں ہوں۔ کوئی بھی وہ نہیں ہے جو کچھ وہ نظر آتا ہے۔ ہم سب ایک زندگی میں کئی کئی زندگیاں گذارتے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا تمھارا ہاتھ میرے کندھے کی طرف بڑھا تھا لیکن لمحے کے ایک خفیف سے وقفہ میں ہی وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ جیسے پھولوں کی ڈال کو اچانک کسی نے کاٹ دیا ہو تم نے میری بات کو کاٹا نہیں۔ خاموشی سے اپنی چیزوں کو سنبھالتے رہے اور مجھ سے ایک دم بے نیاز ہو گئے۔

"چائے یہیں لے آؤں؟" میں نے خاموشی توڑی۔
"لے آؤ۔"

میں چائے ڈرائنگ روم ہی میں لے آئی۔
"تم نہیں پیوگی؟"
"ابھی نہیں۔"

تم سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ پوچھ ہی لیتے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں چائے نہیں پی رہی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی نفسیاتی ضرورتیں زندگی میں بعض اوقات کتنی اہم ہو جاتی ہیں۔ چائے کی پیالی تو میں اپنے لیے بنا کر میز پر رکھ آئی تھی۔ سوچا تھا تم ضرور اصرار

کرو گے اور میں فوراً ہی لپک کر اپنی پیالی میز سے اٹھا لاؤں گی۔ لیکن تم نے تو کچھ بھی نہ کہا۔ جلدی جلدی چائے پینے میں لگے رہے چائے کی پیالی ختم کر چکنے پر بولے۔

"اچھا تو میں اب ہوٹل جا رہا ہوں۔ شام کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا"

"یہیں رک جاؤ نا؟"

"نہیں۔ اس بار نہیں"

تم نے یہ کہتے ہوئے اپنا ایرکیس اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھے جو اب تک کھلا تھا۔ جسے رچنا بند نہیں کر گئی تھی۔

دروازے پر لمحہ بھر کے لیے رُکے بھی۔ میری طرف دیکھا بھی۔ میں سوچتی رہی شاید جانے سے پہلے ایک بار تمھارا ہاتھ میرے کندھے کی طرف بڑھے اور اسے ہلکا سا دبا دے۔ شاید تمہاری انگلیاں میری انگلیوں کو چھولیں۔ تمھارے جسم کا کوئی حصہ آن جانے میں میرے جسم سے مس کر جائے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور تم اچانک بائی کہہ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ چوپڑہ صاحب کے بارے میں بھی بات نہیں کی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے دروازہ بڑی کٹھورتا سے بند کیا اور سیدھی باتھ روم کی طرف لپکی۔ باتھ روم کا دروازہ بھی نہیں بند کیا ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا اور دیوار کے ساتھ لگی اپنے اوپر ٹھنڈے

پانی کی پھوار ڈالتی رہی۔
اور پھر میں نے دلوار میں لگے ریک کی طرف دیکھا جہاں صابن برش، ٹیلکم پاؤڈر اور اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں رکھی تھیں۔ اور میری نظر اچانک وین سا بریوڈی کلون کی کھلی شیشی پر پڑی جسے تم تھوڑی ہی دیر پہلے استعمال کر چکے تھے۔ کلون کی تیز خوشبو میرے دماغ پر چھائی جا رہی تھی تم کیوں چھوڑ گئے تھے یوڈی کلون کی کھلی شیشی کو میرے گھر؟؟

اور پھر میں نے اپنے جسم کو پونچھے بغیر اپنے اردگرد بڑا سا تولیہ لپیٹا اور بیڈروم میں جا کر پلنگ پر گر گئی ایک دم نڈھال اور ٹوٹی ہوئی سی۔

اور جانے کتنی مدت اسی حالت میں پڑی رہی۔
کتنے لمحے، کتنے سال، کتنی صدیاں۔

ڈاک گھر کی شہزادی

اس کا گھر ڈاک گھر کے عین سامنے تھا۔
سڑک کی اس پار شاملاتی قسم کے کنوئیں کے مقابل پہلا مکان کیدار ہی کا تھا۔ اس کے پہلو میں دیال نمبردار کی حویلی تھی۔ دیال موضع دھن کوٹ کا نمبردار تھا۔ زمینیں تو اس کی گاؤں ہی تھیں لیکن رہائش اُسے شہر کی پسند تھی۔ چنانچہ اس نے شہر میں چار آنہ گز کے حساب سے کوئی سات سو مربع گز زمین خرید کر اس پہ پکی اینٹوں کا مکان بنوا لیا تھا۔ اگرچہ اس کے فوت ہو جانے پر اس کے بیٹوں نے گاؤں کی ساری زمین بیچ ڈالی تھی اور اس طرح نمبرداری کی وراثت ختم کر ڈالی تھی لیکن وہ حویلی ابھی تک دیال نمبردار کی ہی حویلی کہلاتی تھی۔ حویلی کے برابر والا مکان شیو نارائن شرما انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کا تھا۔ جو مکان سے زیادہ ایک بڑا سا موٹر گیراج نظر آتا تھا۔ شرما اپنی کنٹرول دار مونچھیں بڑے اہتمام سے سجاتا تھا۔ کیدار بٹوارے کے بعد جب یہاں آیا تو

پہلا شخص جس سے اس کی ملاقات ہوئی وہ بیمہ نارائن شرما تھا۔ اس کی کنڈل دار مونچھوں کو دیکھ کر اسے ایک لطیفہ یاد آیا تھا جو اس نے کالج کے زمانے میں کسی سے سنا تھا۔

بچھوؤں کی ایک ٹولی اپنے ڈنک اٹھائے ہوئے بڑی شان سے قطار میں جا رہی تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ کسی نے پوچھا تمہارا لیڈر کون ہے؟

جواب ملا۔ جس کی پشت پر ہاتھ رکھ دو وہی لیڈر ہے۔

لیکن شرما کی مونچھوں کے ڈنکوں میں زہر کی بجائے شہد تھا اور اسی شہد سے اس کا انشورنس کا کام کامیابی سے چل رہا تھا۔

دیال نمبردار کی وسیع لیکن قدرے بے وضع حویلی۔ شرما کا گیراج نما گھر، محلے کا پرانا نشا ملانی کنواں جس کے اردگرد پانی کی وجہ سے ہر وقت مچھروں کے دل جمے رہتے تھے اور سامنے پرانا، اندھیرا اور سیلن سے اٹا ہوا ڈاک گھر۔ اس سارے ماحول میں کیدار کو بے حد اکتاہٹ محسوس ہوتی اور اس اکتاہٹ میں اضافہ کرنے والی نچلی منزل میں قیام پذیر مکان کی مالک ایک سود خور بنیائن تھی جو شہر کے بھنگیوں کو روپیہ قرض دیا کرتی تھی۔ اس کے ہاں بھنگنوں کا میلا سا لگا رہتا تھا جو اپنے چاندی کے گہنے اس کے پاس رہن رکھنے آتی تھیں۔ وہ بنیائن شکل وصورت اور سود خوری سبھی لحاظ سے بیٹھان تھی۔ کیدار اس کی کرخت، اونچی اور کھردری آواز سے بچنے کے لیے

کمروں کے دروازے اکثر بند رکھتا تھا۔ اسے ہر ماہ کی تیس تاریخ
کو ہی اگلے مہینے کا کرایہ دے دیتا تھا اور صبح اٹھتے ہی چھت
پر چڑھ جاتا کہ اسے بنیائن کی صورت نظر نہ آئے اور بازار میں
گزرتے ہوئے کسی شخص یا کنوئیں پہ پانی بھرنے والی کسی عورت
کی شکل دیکھ کر ہی وہ دن کا آغاز کرے۔ کیدار و یسے تو وہمی
طبیعت کا نہیں تھا لیکن صبح کسی غلط قسم کے آدمی کا منہ دیکھنے
سے ہمیشہ بچتا تھا۔ جب کبھی سود خور بنیائن اس کے ماتھے لگتی اس کا
دن برا کٹتا تھا۔

صبح سویرے اٹھ کر دیال نمبردار کی حویلی، شرما کے گھر،
محلے کے کنوئیں اور پھر ڈاک گھر کی پرانی عمارت پہ نظر ڈالنا کیدار کا
معمول بن چکا تھا۔ یہ اس کے روزمرہ کے پروگرام کا ایک جزو تھا
ویسے تو ڈاک گھر کی ساری عمارت ہی اسے کال کوٹھڑی سی نظر
آتی تھی لیکن اس کا سڑک کی طرف کھلتا ہوا برآمدہ اسے اور بھی
اکھرتا تھا۔ لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والی کھڑکیوں کے پیچھے
میزوں پر جھکے ہوئے پوسٹل کلرک اسے ان قیدیوں کی طرح نظر
آتے جنھیں عمر بھر کی قید ملی ہو اور جنھیں دیکھنے کے لیے تماشائی
برآمدے میں کھڑے ہوں اور ان کا منہ چڑا رہے ہوں۔ اسے
ان کلرکوں پر بڑا ترس آتا اور ان تماشائیوں پر بے حد غصہ۔ کون
ہے جو قیدی نہیں؟ وہ سوچتا، کون ہے جو آزاد ہے؟ کس نے

کوئی جرم نہیں کیا؟ کس کے سر کسی کا خون نہیں؟ پھر کون کسی کو مجرم ٹھہرا سکتا ہے؟

اور اس کے ان سوالوں کا جواب اسے چمپا نے دیا تھا جسے وہ دو سال سے دیکھتا آرہا تھا۔

چمپا کا اصلی نام کیدار کو معلوم نہیں تھا۔ شاید چمپا بھی اُسے بھول گئی تھی۔ وہ کہاں سے اور کیسے یہاں آئی تھی۔ کون اُسے یہاں لایا تھا اور کیوں لایا تھا۔ ان سب باتوں کا کیدار کو علم نہیں تھا۔ اُسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک صبح جب وہ گھر سے باہر نکلا تو ایک جوان، خوبصورت، گورے رنگ کی عورت نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے ریشمی لیکن پرانے تھے۔ اس نے کسی اجنبی زبان میں کیدار سے بات کی اور اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ اسے پنجابی، ہندی اور انگریزی کے علاوہ کوئی اور زبان نہ آتی تھی۔ وہ اس کی بات تو نہ سمجھ سکا تھا لیکن اس کے حسن و شباب سے ضرور متاثر ہوا تھا وہ پل بھر کو رکا۔ اس نے اس عورت کی بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن نہ سمجھ سکا اور جب وہ آگے سرکنے لگا تو اس عورت نے اس کا بازو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں جوڑ کر ہونٹوں کے ساتھ لگاتے ہوئے کیدار کی طرف دیکھا۔ اب کیدار جان پایا کہ اسے سگریٹ کی حاجت تھی۔ اس نے جیب میں سے

سگریٹ کا پیکیٹ نکالا، ایک سگریٹ اسے دیا دوسرا اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ اور پھر پہلے اس کا اور بعد میں اپنا سگریٹ جلا کر آگے بڑھنے لگا تو عورت نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ یہ اس قصبے میں اس اجنبی پاگل عورت کا پہلا قہقہہ تھا جو دیر تک کیدار کا تعاقب کرتا رہا۔ کیدار اس قصبے کا پہلا آدمی تھا جس کی شکل اس پاگل عورت نے دیکھی تھی۔ کیدار جب تھوڑی دیر گھوم کر واپس آیا تو وہ اجنبی عورت ڈاک گھر کے برآمدے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ وہ آنکھ بچا کر نکل گیا۔

کیدار نے اب صبح سویرے چھت پر چڑھنے کی بجائے تھوڑی دیر سیر کرنے کی عادت ڈال لی تھی۔ وہ جب گھر سے باہر نکلتا وہ اجنبی پاگل عورت سامنے کھڑی ہوتی، اُسے دیکھ کر مسکراتی۔ وہ اسے ایک سگریٹ دیتا۔ اُسے سلگاتا اور آگے بڑھ جاتا اور عورت کے قدرے بے ترتیب قہقہے اس کا پیچھا کرتے رہتے۔

بہت دنوں تک یہ معمول چلتا رہا۔ کیدار نے اب اسے ایک پُرانی رضائی اور پرانا تکیہ بھی دے دیا تھا اور جانے کس نے اور کیسے اس کا نام چمپا رکھ دیا تھا۔ بازار میں آس پاس کے دکان دار اُسے چمپا کہہ کر پکارتے تھے اور اس سے چھیڑ خانی کرتے تھے۔ وہ ان کی زبان سے ناواقف ہونے کے کارن کچھ نہ سمجھتی تھی اور جواب میں صرف مسکرا دیتی تھی اور وہ اسے سگریٹ

بیڑی آنہ ٹکہ، ایک آدھ روٹی اور اس قسم کی چیزیں دیتے تھے جنھیں وہ مسکراتے ہوئے لے لیتی تھی۔ اس کے دانت چھوٹے چھوٹے اور ہموار تھے اور جب وہ مسکراتی تھی تو اچھے لگتے تھے۔ اس کے اعضا میں گٹھن اور جسم میں سڈول پن تھا۔ محسوس ہوتا تھا جیسے اُسے پاگل ہوئے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہ دن بھر بازار میں ادھر ادھر گھومتی اور بیڑی پیتی رہتی اور اس کی رضائی اور تکیہ ڈاک گھر کے برآمدے میں ایک طرف پڑا رہتا۔ رات کو وہ یہی رضائی لپیٹ کر سو جاتی اور صبح دن چڑھے سے پہلے اٹھ جاتی۔ پاگل پن کے باوجود وہ اس شخص کو نہیں بھولی تھی جس نے اسے اجنبی قصبے میں پہلے روز صبح سویرے سگریٹ دیا تھا۔ اسے اب بھی کیدار کا انتظار رہتا تھا اور جب ایک بار کیدار بیمار پڑ گیا اور کئی روز تک گھر سے باہر نہ نکلا تو چمپا کونے میں کھڑی ہر صبح اس کا انتظار کرتی رہتی اور بے حد اداس رہنے لگی۔ کسی نے اسے سگریٹ دیا تو بنا مسکرائے لے لیا۔ گویا سگریٹ دینے والے کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس کی مسکراہٹ میں اس کی احسان مندی کی گواہی تھی۔

کیدار کے لیے چمپا اپنے ماحول کا ہی ایک جزو بن گئی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ ماحول جس میں وہ جی رہا تھا نامکمل تھا۔ نمبردار کی حویلی، شرما کا گھر، شاملاتی کنواں، یہ سب کسی کہانی کے حصے تھے لیکن کہانی ادھوری تھی اور جس دن سے چمپا آئی تھی یہ کہانی

مکمل ہوگئی تھی۔ کہانی کو جیسے ایک جیتا جاگتا، سانس لیتا ہوا، حرکت کرتا ہوا عنوان مل گیا تھا۔

چمپا کو کہیں سے ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی اور بدوضع سا آئینہ مل گیا تھا اور وہ ہر صبح ڈاک گھر کے برآمدے میں بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور ان میں گاڑھے سُرخ رنگ کا ربن ڈالتی تھی۔ اس کا جسم کچھ اور بھر گیا تھا اور پہلے سے اچھا لگنے لگا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس میں ایک اور تبدیلی بھی تو آگئی تھی۔ لوگوں کی چھیڑ خانی کے کارن اب وہ غصے میں آکر چلاّتی تھی۔ کسی اجنبی زبان میں جسے کم سے کم اس قصبے کا ایک بھی آدمی نہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ ریشمی قمیص اور لہنگا جو اس نے پہن رکھا تھا اب کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس کے جسم کے انگ ان دریچوں سے باہر جھانکتے رہتے تھے۔

ایک رات کیدار نے چمپا کے زور زور سے بولنے کی آواز سنی جیسے وہ کسی کو گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر نیچے سڑک کی طرف دیکھا۔ پرکھانی چوکیدار ہاتھ میں لٹھ لیے کھڑا تھا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو بے چاری کو؟" کیدار نے کھڑکی سے باہر ذرا جھک کر چوکیدار سے کہا۔

چوکیدار چونکا۔

"یوں ہی ذرا مجاک کر رہا تھا، بابوجی" چوکیدار نے جواب دیا اور اپنا لٹھ زور سے سڑک پر ٹیک کر آگے چل دیا اور پھر اس کی

آواز گونجی "ہوشیار، خبردار، جاگتے رہو"

اس سے اگلی رات بھی چوکیدار نے چمپا کو گالیاں بکتے ہوئے سنا اور چوکیدار کو ڈاک گھر کے برآمدے کے سامنے کھڑا دیکھا۔ کیدار نے جب اسے پھٹکارا تو وہ سر جھکائے آگے بڑھ گیا لیکن بڑبڑاتا رہا۔ "سالا اس پاگل چھوکری کو بھی اپنی جائداد سمجھتا ہے۔"

اور کیدار اس کے لٹھ کی آواز اور اس کے "ہوشیار، خبردار، جاگتے رہو" کی گونج سنتا رہا۔

کئی راتوں تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ کیدار جیسے واقعی بڑی دیانتداری سے اپنی جائداد کی حفاظت کر رہا تھا۔

لیکن پھر کبھی چمپا کے بکنے جھکنے کی آواز نہیں آئی۔ اس نے اب گالیاں دینا بند کر دیا تھا۔ اب اُسے ایک دوسری قسم کی پرانی قمیص اور دوسرے ہی رنگ کا لہنگا مل گیا تھا۔ جس میں کہیں کوئی زخم نہ تھا جن میں سے اس کے جسم کی چاندی رستی تھی۔ اب وہ کیدار سے سگریٹ لینے کے لیے راستے میں کھڑی نہ ہوتی تھی، بلکہ ڈاک گھر کے برآمدے میں رضائی لپیٹے پڑی رہتی تھی اور کیدار اسے وہیں ڈاک گھر کے برآمدے میں ہی سگریٹ دیتا تھا اور کبھی کبھی تو وہ گہری نیند سوئی ہوتی تھی اور کیدار سگریٹ اس کے تکیے پر رکھ کر سیر کو نکل جاتا تھا۔

پھر ایک روز کیدار کو یہ جان کر بے حد صدمہ ہوا کہ چمپا پیٹ سے تھی اور حالات خاصی نازک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس کی غفلت کے کارن اس کی جائداد لٹ گئی تھی۔ وہ دن اس کا بڑا تانج گذرا۔ اسے یقین تھا کہ اس گناہ کا مرتکب بازار کا چوکیدار پربھاتی ہی تھا۔ لیکن اس کے پاس اس بات کا کیا ثبوت تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ چمپا کا کیا حشر ہوگا۔ کیدار پریشان ہوتا رہا اور آنے والے حالات کا انتظار کرتا رہا۔ بازار کے دکاندار چمپا کو چھیڑتے، اسے ستاتے اور تنگ کرتے۔ وہ ان کے طعنے سن کر گالیاں بکتی اور وہ ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ کیدار دیکھتا تو وہ انہیں ڈانٹ بھی دیتا۔ لیکن وہ ہر گھڑی وہاں تھوڑا ہی موجود رہتا تھا۔ لوگ جب بھی موقع ملتا چمپا کو پریشان کرتے اور وہ بے چاری اچھا خاصا مذاق بن کر رہ گئی، لیکن اس کے بالوں کی گھٹائیں اب بھی کالی تھیں اس کے دانتوں کے موتی اب بھی چمکتے تھے اور اس کے حسن کی جاذبیت اب بھی قائم تھی۔

آدھی رات کے قریب کیدار نے چمپا کی چیخوں کی آواز سنی اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ ڈاک گھر کی شہزادی برآمدے میں پڑی بری طرح چیخ رہی تھی۔ کیدار سیڑھیاں اتر کر فوراً اس کے پاس پہنچا، اسے سگریٹ دیا لیکن اس نے سگریٹ نہیں لیا صرف اپنے پیٹ پہ ہاتھ مارتی رہی۔ کیدار نے پاس کے بس سٹینڈ سے ایک رکشہ والے کو جگایا۔ چمپا کو بڑی مشکل سے اس میں

لا دا اور اسے فوراً ہسپتال لے گیا۔ وہ تمام راستہ چیختی اور چلاتی
رہی۔ ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرا کر اس نے چمپا کو ڈاکٹر کے
سپرد کیا اور خود ہسپتال کے وسیع احاطے میں مولسری کے درخت
کے نیچے بیٹھا سگریٹ پھونکنے لگا۔ اس نے پیٹھ درخت کے تنے سے
لگا دی اور سوچنے لگا کہ بچہ پیدا ہوا تو اسے سنبھالے گا کون۔؟
چمپا کو اتنا ہوش کہاں ہوگا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔ کتنا ظلم
کیا تھا چوکیدار نے اس بے کس اور لاچار عورت پر، جسے یہ معلوم
ہی نہ تھا کہ کوئی اسے کہاں لے جا رہا تھا۔ اس نے ایک حواس کھوئی
عورت کے وشواش کا کس بری طرح گلا گھونٹا تھا۔ وہ آنکھیں بند
کیے چوکیدار کے پیچھے چلتی گئی اور اس نے اسے پہاڑ کی آخری چوٹی
سے ایک زور کا دھکا دے کر نیچے پھیلتی ہوئی عمیق کھائی میں گرا دیا
اور اب اس کی ہڈیاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی تھیں اور اس کے
جسم کا ایک ایک انگ کٹ گیا تھا۔ کیدار اسی قسم کی باتیں سوچتا
رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا اور رات بے آواز قدموں سے گزرتی
رہی اور چمپا ایک نئے انسان کی تخلیق میں مصروف بے سدھ پڑی
کراہتی رہی۔ اور پھر پربھات کا ملگجا اجالا کسمسایا اور آپریشن
تھیٹر سے باہر نکلتی ہوئی نرس نے بتایا کہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا اور
کیدار پھٹی پھٹی آنکھوں سے نرس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور
اس کی انگلیوں میں تھمی سگریٹ سلگتی رہی اور پھر وہ دھیرے دھیرے

ہسپتال کے احاطے سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے دل و دماغ
پر ایک درد بھرا بوجھ تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پاگل
اور بے سہارا اور مجبور عورت سے اس کا کوئی غیر واضح اور ان بوجھا
رشتہ تھا۔ ایک ایسا تعلق جس کی وہ تشریح نہیں کر سکتا تھا۔ ایک
ایسا سمبندھ جس کی تفصیل نہ دی جا سکتی تھی۔ جس کی کوئی رُوپ
ریکھا نہ بن سکتی تھی، لیکن جو ایک گہرے انسانی جذبے پر مبنی تھا۔
ایک ایسا جذبہ جو انسانوں کو بغیر مذہب و ملت اور عقل و ہوش کا
امتیاز کیے ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔

چمپا جتنے روز ہسپتال میں رہی، کیدار صبح شام اسے دیکھنے جاتا
جب تک اس کے جسم میں نقاہت اور پاؤں میں لغزش رہی وہ بستر
پر پڑی رہی اور جب اس کے نڈھال جسم میں طاقت آ گئی تو وہ
ایک شام ہسپتال سے بھاگ آئی اور ڈاک گھر کے ویران برآمدے
میں پھر سے ڈیرہ جما لیا اور جب وہ ہسپتال سے بھاگی تو ایک تکیہ
چادر میں لپیٹ کر ساتھ لے آئی جیسے وہ اپنے مرے ہوئے بچّے کی
سانسیں، اس کی دھڑکنیں اور مردہ مسکراہٹیں اپنے آنچل میں چھپا
کر لے آئی ہو۔ وہ دن بھر تکیے کو اپنے کندھے سے لگائے گھومتی رہتی
جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سلانے کے لیے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے
ادھر ادھر ٹہل رہی ہو۔ لوگ اس سے مذاق کرتے، چڑاتے، ستاتے
اور وہ منہ میں بڑبڑاتی ہوئی تکیے کو اپنے جسم کے ساتھ بھینچ لیتی کہ

کوئی اسے چھین نہ لے اور پھر بھاگ کر ڈاک گھر کے برآمدے میں آجاتی اور اس کی التجائیں اور منتیں دم توڑنے لگتیں اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بھنچ جاتیں اور تکیہ اس کی چھاتی سے لگ جاتا۔

کیدار اب بھی اُسے سگریٹ دیتا۔ دوسرے تیسرے دن مٹی کے کٹورے میں دودھ ڈال دیتا اور کبھی کبھی اس کی جھولی میں پھل بھی ڈال دیتا لیکن اب وہ مسکراتی نہیں تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہتی اور ایک لفظ تک نہ بولتی۔ جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو۔ جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

اور دن گزرتے گئے۔

اور پھر ایک صبح کیدار نے دیکھا ایک نوجوان مرد اپنے جسم پہ ایک پھٹا ہوا کمبل لپیٹے بیڑی پیتے ہوئے بازار میں سے گزرتے ہوئے آیا اور ڈاک گھر کے برآمدے میں دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ کیدار نے جان لیا کہ ہوش مندوں کی بستی میں ایک اور دیوانہ وارد ہوا ہے۔ ڈاک گھر کے برآمدے کی رونق بڑھ گئی تھی اور اس کی توجہ کا مرکز بننے کے لیے ایک اور کردار آگیا تھا۔ اور چمپا، جسے وہ ڈاک گھر کی شہزادی کہا کرتا تھا، اپنے جنون کی وابستگیاں ساتھ لیے جئے جا رہی تھی۔

یہ نیا دیوانہ بڑا بے نیاز قسم کا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی چیز نہ مانگی۔ کبھی کسی دکان کے سامنے کھڑا نہ ہوا۔ کسی راہ گیر سے بات نہ کی۔

بس اپنے حال میں مست ۔ چل رہا ہے تو چلے ہی جا رہا ہے ۔ بیٹھا ہے تو گھنٹوں دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیکے بیٹھا رہے گا ۔ بیڑیاں پی رہا ہے تو مسلسل پیے جا رہا ہے ، جب تک کہ بنڈل کا بنڈل ختم نہیں ہو جاتا تھا ہیں دیوانے تو اور بھی تھے لیکن یہ تو دیوانوں کا بادشاہ تھا ۔ بالکل ہی الگ اور اچھوتا ، جس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا یہاں تک کہ اس نے چمپا کی طرف بھی دھیان نہ دیا ۔ جیسے ڈاک گھر کے برآمدے پر سوائے اس کے کسی اور کا ادھیکار ہی نہ تھا ۔ پر بھاتی چوکیدار نے اپنی ڈیوٹی بدلوا کر شہر کے دوسرے حصے میں لگوالی تھی اور اب ایک اور چوکیدار آگیا تھا ، جو سوتا زیادہ تھا ، پہرہ کم دیتا تھا

اور ایک دن کیدار نے صبح سویرے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو چمپا اپنے تکیے کو سینے سے چمٹائے سو رہی تھی اور دیوانہ دیوار کا سہارا لیے بیڑی پی رہا تھا اور سوئی پڑی چمپا کو ایک ٹک گھورے جا رہا تھا ۔ چمپا کا گدرایا ہوا جسم اس کی پھٹی ہوئی قمیص سے یوں باہر جھانک رہا تھا جیسے جھاڑ جھنکاڑ میں چاند کی کرنوں کی اوٹ سے ابلتا ہوا چشمہ چمک رہا ہو ۔ دیوانے کی نظریں یوں گڑی تھیں جیسے ان میں کیلیں گاڑ دی گئی ہوں ۔ جانے کیوں کیدار کو یہ سب اچھا لگا ۔ ایک ہوش کھویا انسان دوسرے ہوش کھوئے انسان میں دلچسپی لینے لگا تھا ، اس سے ایک لگاؤ محسوس کرنے لگا تھا ۔ ایک سمبندھ کی روپ ریکھا بننے لگی تھی ۔ ایک تعلق کی بنیاد پڑنے جا رہی تھی ۔ کیدار

زندگی کا یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے جنون کی ایک نئی گھٹنا تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ڈاک گھر کا مٹی سے اٹا ہوا برآمدہ اس کے اندھیرے کمرے اور میزوں پر ممیوں کی طرح بت بنے کلرک سب زندگی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ زندگی اپنی خوبصورتیاں وابستگیاں اور لطافتیں لے کر آگئی تھی اور انھیں جھولیاں بھر بھر کر لٹا رہی تھی۔ ہوش کھوئے ہوئے لوگ باہوش ہو رہے تھے اور بیہوش انسان ہوش کی اُن حدوں سے گذر رہے تھے جو انھیں زندگی کی خوبصورتیوں سے دور رکھتی ہیں اور ان سیماؤں میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے سپنوں کے سنگ میل شروع ہوتے ہیں اور امیدوں کی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں اور آرزوؤں کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور تمناؤں کی کلیاں چٹکتی ہیں اور کاہکشاں کی کہکشاں اپنی مانگ میں موتی ٹانک کر انتاسے کرتی ہے اور رات اپنے گیسو کھولے صبح کے دریچے سے جنتوں سے آتی ہوئی عطر بیز ہواؤں کا انتظار کرتی ہے۔

اور پھر کیدار کچھ دنوں کے لیے باہر چلا گیا۔

ڈاک گھر کے سامنے کھلتی ہوئی کھڑکی بند ہو گئی۔

اور سامنے کے مکان میں رہنے والی بیتیائن کی پاٹ دار آواز اور بھی اونچی ہوتی گئی۔

اور جب دس روز کے بعد کیدار واپس لوٹا تو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی اسے چمپا کا خیال آ گیا۔ اور اس کے ساتھ اس دلوانے

کا بھی جو ایک صبح چمپا کو بڑی لگن سے گھور رہا تھا۔ یوں تو گاڑی ٹھیک چار بجے پہنچتی تھی، لیکن لیٹ ہونے کے کارن آج پانچ بجے پہنچی تھی۔ کیدار قلی سے سامان اٹھوا کر رکشا میں بیٹھا اور رکشا والے کے پوچھنے پر کہ اسے کس جگہ جانا تھا۔ اس نے جواب دیا۔
"ڈاک گھر کے سامنے"

یہ الفاظ کہتے ہی اسے چمپا کا دھیان آیا اور اس کے بھرے بھرے جسم کا اور اس کی وحشی آنکھوں کا اور اس کے لمبے بالوں کا اور اس کے تکیے کا جسے وہ ہر لمحہ سینے سے چمٹائے رکھتی تھی۔

رکشا کے پہیے گھوم رہے تھے اور کیدار نئے دیوانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانے کیا کر رہا ہو گا۔ اس وقت وہ غالباً سو رہا ہو گا۔ لیکن اب تو لوگ جاگ رہے تھے۔ سویرا ہونے والا تھا۔ نہیں وہ جاگ رہا ہو گا۔ اور بیڑی پی رہا ہو گا اور دیوار کے ساتھ بیٹھ ٹیکے چمپا کے گدرائے ہوئے انگوں کو گھور رہا ہو گا۔ جو اس کی پھٹی ہوئی قمیص کے دریچوں سے باہر جھانکتے رہتے تھے کیدار نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ وہ اصولاً صبح سویرے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ پہلا سگریٹ، وہ اس سمے پیتا تھا جب چائے کی گرم گرم پیالی اس کے ہونٹوں کو چھوتی تھی۔ لیکن جب اس کا دماغ سوچ کی بھول بھلیوں میں ہوتا تو وقت کی کوئی تخصیص نہ

رہتی۔ سگریٹ کسی بھی لمحہ سلگ سکتا تھا۔ چاہے آدھی رات ہو یا
بھور کا ملگجا اجالا، اور اب بھور کے ملگجے اجالے میں سگریٹ
کا دھواں فضا میں تحلیل ہو رہا تھا اور رکشا کے پہیے تار کول کی
سڑک پر گھوم رہے تھے۔

رکشا رک گئی تھی۔

ڈاک گھر آ گیا تھا۔

کیدار نے رکشہ والے کو کرایہ دیا اور اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر
گلی کی طرف مڑا۔ انشورنس کمپنی والے شرما کے کھانسنے کی آواز
آ رہی تھی۔ وہ جاگ اٹھا تھا۔ کنوئیں کی جگت پر بھی دو ایک
سائے حرکت کر رہے تھے۔ گلی کی بہوئیں منہ اندھیرے پانی بھرنے
آ گئی تھیں۔ ساسیں بھلا انھیں دیر تک کہاں سونے دیتی تھیں۔ گلی
میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سوچا وہ ڈاک گھر کے برآمدے
کی طرف تو ایک نظر ڈال لے اور نہ جانے کیوں پہلے اس نے برآمدے
کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں وہ نیا دیوانہ سویا کرتا تھا۔
وہ جگہ خالی تھی۔ کیدار کو دھکا سا لگا۔ کمبخت شہر چھوڑ گیا تھا
شاید۔ ان دیوانوں کو کسی سے کیا دلچسپی! رمتے جوگی ٹھہرے۔ جدھر
دھن سمائی نکل پڑے۔ وہ اٹیچی کیس سنبھالے برآمدے کی طرف بڑھا
اس سمت جہاں چمپا سویا کرتی تھی۔ ارے یہ کیا! اور کون سویا
پڑا ہے یہاں؟ وہ اور آگے بڑھا۔ برآمدے کے اندر چمپا مرے

سے سو رہی تھی۔ کروٹ لے کر اور اس کا دایاں بازو لٹکا ٹھانئے
دیوانے کی گردن پر جو اس کے پہلو میں بے خبر سویا پڑا تھا۔ کیدار
کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

ڈاک گھر کی شہزادی ملکہ بن گئی تھی۔

کیدار گلی میں جانے کو مڑا۔ دو کتے کسی چیز کو اپنی طرف کھینچتے
ہوئے اپنے کھیل میں مگن تھے۔ اس نے دیکھا یہ تو وہ تکیہ تھا جسے
چمپا ہر لمحے اپنے ساتھ چمٹائے رکھتی تھی۔ کتے اسے جانے کب اٹھا
لائے تھے اور اس کی روئی ادھر اُدھر بکھر رہی تھی اور چمپا کو
آج جیسے اس کی فکر ہی نہ تھی۔ ایک غلیظ گھٹیا اور پرانا سا تکیہ
ہی تو تھا آخر!

ایک ملکہ کا ایسی حقیر چیزوں سے کیا واسطہ!

وہ پل بھر کتوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے
دیکھتا رہا اور پھر اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا۔

ایک عورت ایک ساڑھی

صبح چھ بجے کال بیل گونجی۔

دسمبر کا مہینہ، اتوار کا دن اور صبح صبح کی پیاری نیند۔ میں نہایت ہی غصہ میں اپنے بستر سے اٹھی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے ہمارے اسکول کا رکشہ والا چھوکرا بنواری کھڑا تھا۔ جاڑے میں ٹھٹھرتا ہوا اس کا چہرہ ایک دم بجھا ہوا تھا۔

"مس تلوارڑ کی رات ڈیتھ ہو گئی۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"مگر رات تو وہ بھلی چنگی تھیں۔"

"میں ہی تو انھیں کل آپ کے گھر سے لے کر گیا تھا۔ مجھے صبح چھ بجے آنے کو کہا تھا۔ دہلی سے ان کا بھتیجا آنے والا تھا۔"

میں ایک دم سکتے میں آ گئی۔ رات وہ میرے ہاں کھانا کھا کر قریب نو بجے گئی تھیں۔ یہ چند گھنٹوں میں کیا ہو گیا تھا انھیں۔

"لیکن ہوا کیا مس تلوار کو؟" میں نے پوچھا۔

"صبح چھ بجے جب میں پہنچا تو دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں دروازہ کھٹکھٹا کر اندر پہنچا، مس تلوارڑ کو آواز دی لیکن جواب نہیں آیا۔"

"پھر؟"

"میں تیزی سے اُن کے سونے والے کمرے کی جانب بڑھا بجلی جل رہی تھی اور وہ بستر میں پڑی بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا "ڈاکٹر"

مجھ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ میں بنواری رکشہ والے کو اندر آجانے کو کہتی اور اس تیز ٹھنڈی ہوا کا خیال کرتی جو تیزی سے اندر آرہی تھی میں وہیں دروازے پر کھڑی تھی اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ایک دم بے جان ہو گئی تھی۔

"کیا کیا تم نے پھر بنواری؟"

"میں اپنے سیکٹر کے اُن سبھی ڈاکٹروں کے گھر پہنچا جن کا مجھے پتہ تھا۔ صرف ڈاکٹر مہاجن گھر پر ملا۔ اُسے لے کر واپس پہنچا مس تلوارڑ کا بھتیجا، کالکا میل سے آچکا تھا مس تلوارڑ بستر پر مردہ پڑی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح اُسے گھورے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر مہاجن نے نبض دیکھی ٹونٹی لگائی اور پھر بڑے افسوسناک لہجہ میں گردن ہلا کر چلا گیا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میری بھی چیخ نکل گئی اور روئی کی بھی"

"یہ تو بڑا ظلم ہوا بنواری"

"جی ہاں مس صاحب سب سے پہلے آپ ہی کو خبر کرنے آیا ہوں"

"صبح صبح بڑی منحوس خبر سنائی ہے بنواری"

"اور کر بھی کیا سکتا تھا مس صاحب"

"اچھا تم دوسری ٹیچرز کو خبر کر دو۔ میں تھوڑی دیر میں مس تلوار کے گھر پہنچتی ہوں" بنواری چلا گیا اور میں دروازہ بند کر کے اندر چلی آئی اور اپنے بستر میں بیٹھ گئی۔ میری آنکھیں نم ناک تھیں۔ میں دیر تک سوچتی رہی۔ مس تلوار کے بارے میں اور ان دنوں کے بارے میں جن کے گزرنے کے ساتھ میں نے انھیں جانا تھا۔

چار برس پہلے مس تلوار شملہ کے سرکاری اسکول سے بطور پرنسپل ریٹائر ہو کر چنڈی گڑھ آ گئی تھیں اور سیکٹر بیس میں اپنے نامکمل مکان کو مکمل کروایا تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد چنڈی گڑھ میں ہی رہنا چاہتی تھیں۔ شملہ میں اس لیے رہنا انھیں پسند نہیں تھا کہ سردیوں میں وہاں ٹھنڈک بہت زیادہ ہوتی تھی اور سردی سے ان کے جوڑوں کا درد اتنا شدید ہو جاتا تھا کہ وہ چل پھر بھی نہ سکتی تھیں گھٹنوں۔ کہنیوں۔ انگلیوں کے جوڑوں پر اتنی زیادہ سوجن ہو جاتی تھی کہ وہ درد سے کراہنے لگتی تھیں۔ لیکن وہ شملہ سے دور بھی نہیں جانا چاہتی تھیں کیونکہ کوٹ گڑھ میں اُن کے بھائی کے سیب کے آرچرڈ تھے

اور اپنے بھائی سے انھیں اتنا پیار تھا کہ ان کے لڑکے روی کو انھوں نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا اور اسے چنڈی گڑھ ہی میں تعلیم دلا رہی تھیں ۔ روی ان دنوں ڈی، اے، وی، کالج میں پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسی سیشن میں بی ایڈ کیا تھا اور چاہتی تھی کہ کہیں کوئی کام مل جائے ۔ انھی دنوں مس تلواڑ نے اخبار میں اسٹاف کے لیے اشتہار دیا تھا۔ درخواستیں نہیں مانگی تھیں۔ امیدواروں کو صرف پرسنل انٹرویو کے لیے بلایا تھا اور کئی لڑکیوں کی طرح میں بھی انٹرویو کے لیے چلی گئی تھی اور مس تلواڑ نے مجھے سلیکٹ کر لیا تھا میرے ساتھ چار ٹیچرز اور بھی سلیکٹ ہوئی تھیں ۔ لیکن وہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد اسکول چھوڑ گئی تھیں۔ دو کی شادیاں ہوگئی تھیں، اور ایک نے سرکاری ملازمت کر لی تھی ۔ صرف ایک میں رہ گئی تھی مس تلواڑ کے اسکول میں۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نئی نئی ٹیچرز آگئی تھیں لیکن مس تلواڑ کا میرے ساتھ ایک ذاتی رشتہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح مانتی تھیں اور مجھے بے حد پیار کرتی تھیں ۔ ویسے تو ان کا رویہ دوسری ٹیچرز سے بھی مشفقانہ تھا لیکن مجھ سے ان کا لگاؤ شاید اس لیے بھی زیادہ تھا کہ میں ان دنوں سے ان کے ساتھ تھی جب سے انھوں نے یہ اسکول شروع کیا تھا اور مختلف سیکٹروں میں گھوم گھوم کر بچّوں کے پیرنیٹس کو کانٹیکٹ کیا تھا۔ اور کئی مہینوں تک تنخواہ کا تقاضا نہیں کیا تھا۔

وہ اپنے اسکول کی کسی بھی ٹیچر کے گھر نہ جاتی تھیں۔ لیکن میرے گھر ہفتہ میں ایک بار ضرور ہی آتی تھیں اور پھر دیر تک ٹھہرتی تھیں اور اکثر کھانا کھا کر ہی جاتی تھیں۔ اس لیے مس تلواڑ اور میں عمر کے فرق کے باوجود اچھی دوست تھیں۔ ان کی کبھی کبھار کی گفتگو سے جو نتائج میں نے اخذ کیے تھے۔ وہ کچھ اس طرح تھے۔

مس تلواڑ اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی اور فورمین کرسچین کالج لاہور کی پڑھی ہوئی تھی۔ وہیں ان کی دوستی ایک لڑکے گردھر چاولہ سے ہوگئی تھی اور جب انھوں نے ملتان ڈویژن کے ایک گرلز اسکول میں ملازمت شروع کی تو گردھر چاولہ سے ان کی شادی ہوگئی۔ اس شادی پر اس کے والدین رضامند نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے اس کی پرواہ نہ کی تھی اور گردھر چاولہ سے بیاہ کر لیا تھا حالانکہ وہ بی۔ اے۔ بھی پاس نہ کرسکا تھا اور اس کی عادتیں بھی اچھی نہیں تھیں۔ بیاہ کے بعد وہ ایک طرح سے اپنے خاوند کی پرورش ہی کرتی رہی تھیں لیکن چاولہ نے اب یہ ضد کرنا شروع کر دی تھی کہ وہ ملازمت چھوڑ دے اور اپنے والدین سے دس ہزار روپیہ لے کے اس کے ساتھ دہلی چلی جائے جہاں وہ کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ وہ کیا کاروبار کرنا چاہتا تھا یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا اور اس لیے وہ اس بارے میں مس تلواڑ کو بھی کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ مس تلواڑ کو یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنے نام کے ساتھ تلواڑ

ہٹا کر چاولہ لگائے۔ انھیں اپنی انفرادیت کو اس طرح کھو دینا بالکل منظور نہیں تھا۔ وہ خود کو بملا تلواڑ ہی لکھتی تھیں بملا چاولہ نہیں۔ گردھر چاولہ اس بات سے بھی خفا تھا۔ آپس میں اختلافات بڑھتے گئے اور ایک دن گردھر چاولہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ اور پھر انھیں تقسیم ملک تک اس کا کوئی پتہ نہ لگا تھا۔ اور جب تقسیم کے بعد وہ کانگڑہ اسکول میں آگئی تھیں۔ پھر تو چاولہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم کر سکنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آپ کو مس بملا تلواڑ ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ تقسیم سے پہلے ہی ان کی والدہ کی موت ہو گئی تھی اور والد لاہور سے امرتسر آکر کیمپ میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بھائی رونقی رام نے اِدھر ادھر گھومنے کے بعد ان کا کانگڑہ میں ایڈریس معلوم کر لیا تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ کانگڑہ آگئے تھے اور مس تلواڑ کے پاس ہی رہنے لگے تھے۔

رونقی رام نے اپنے والد کی جائداد کے بدلے میں جو جائداد ہندوستان میں الاٹ کرائی تھی اسے بیچ دیا تھا اور کوٹ گڑھ میں سیب کے آرچرڈ خرید لیے تھے اور پھر مس تلواڑ نے بھی کوشش کر کے اپنا ٹرانسفر شملہ کرا لیا تھا۔ وہ اب ترقی کرتے کرتے پرنسپل بن گئی تھیں اور کارٹ روڈ پر لڑکیوں کے اسکول کی ہر دلعزیز اور ڈسپلن کی بڑی کڑی پرنسپل بن گئی تھیں۔ ان کی رہائش بھی اسکول کی کمپاؤنڈ

میں بنی چھوٹی سی کاٹیج ہی میں تھی جسے انھوں نے بڑی محنت سے بہت خوبصورت بنا ڈالا تھا۔

اس کاٹیج میں کرسمس کے دنوں میں روی نے جنم لیا تھا۔ سارا شملہ برف سے ڈھکا تھا اور فضا بہت ہی پرسکون تھی۔ اپنی کاٹیج کے اندر لکڑیاں سلگا کر گرم کیے کمرے کے اندر جب مس تلواڑ نے اس بچے کو پہلی بار دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی انھوں نے اسی روز یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بچے کا نام روی رکھیں گی اور اس کی پرورش کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لیں گی اس رات وہ بے حد خوش تھیں اور انھوں نے رونقی رام کو اپنی تجویز بتائی تھی۔ رونقی رام کو تو یہ منظور تھا لیکن اس کی بیوی نے یہ کہا تھا کہ اُسے بچے کا نام روی پسند تھا لیکن وہ اُسے مس تلواڑ کے ہاں جب بھیجے گی جب اس کے گھر کوئی اور بچہ ہوگا۔ مس تلواڑ یہ سن کر کچھ ڈی پریسڈ ہو گئی تھیں لیکن انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے گہرے جذبات کا اظہار کبھی کسی سے نہ کرتی تھیں۔

رونقی رام اپنے کنبے کے ساتھ کوٹ گڑھ چلا گیا اور مس تلواڑ اپنے آپ کو اپنے روزمرّہ کے پروگراموں میں کھونے کی کوشش کرتی رہیں۔

جب وہ شملہ سے ریٹائر ہو کر چنڈی گڑھ آگئیں تو روی اُن کے

ساتھ ہی آگیا۔ اور یہیں ڈی۔اے۔وی کالج میں پڑھنے لگا۔ مس تلواڑ کو بچوں سے بیحد پیار تھا۔ نرسری کلاسز وہ خود لیتی تھیں اور بچوں کو بڑی ہی خوبصورت نرسری رائمیز یاد کراتی تھیں۔ مس تلواڑ کی صحت بہت اچھی نہیں تھی لیکن ان کی قوت ارادی بڑی مضبوط تھی اور وہ چھوٹی موٹی بیماری کی پرواہ نہیں کرتی تھیں بچے انھیں بے حد پیار کرتے تھے اور بچوں کے پیرینٹس ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

روی بی۔اے۔کر کے چلا گیا اور اس نے دہلی میں ایک پرائیوٹ فرم کو بطور سیلز مین جوائن کر لیا۔ مس تلواڑ زیادہ اس کے حق میں نہیں تھیں لیکن روی کو یہ کام پسند تھا اس لیے انھوں نے رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے مہینے دو ایک روز کے لیے چنڈی گڑھ آجاتا تھا اور یہاں سے ہماچل اور کشمیر کا بھی چکر لگا لیتا تھا۔ مس تلواڑ خوش تھیں کہ روی اپنے کام میں دلچسپی لے رہا ہے۔اب انھیں ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جس سے وہ روی کی شادی کر دیں۔ اپنی تمام جائداد تو انھوں نے روی کے نام کر ہی رکھی تھی وہ جب کبھی بیمار ہوتیں یا اداس ہو جاتیں تو مجھ سے روی کے بیاہ کے بارے میں باتیں کرتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی زندگی ہی میں روی کی شادی ہو جائے۔

اب تو کچھ دنوں سے انھوں نے ساڑھیاں خریدنی شروع

کر دی تھیں اور اپنی ہونے والی بہو کے لیے زیور بھی بنوانے شروع کر دیے تھے۔ کل مس تلوار شام کو سترہ سیکٹر میں دیر تک گھومتی رہی تھیں اور ساڑھیاں پسند کرتی رہی تھیں واپسی پر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی اور انھیں کچھ سردی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں انھیں اپنے گھر لے آئی تھی اور نیواری رکشا والے کو کہا تھا کہ وہ انھیں رات کو واپس لے جائے گا۔ نیواری تو ایک طرح سے اسکول ہی کا رکشا والا تھا۔ کیونکہ وہ سوائے اسکول کے بچوں اور مس تلوار کو ادھر ادھر لے جانے کے.... کوئی دوسرا کام نہیں کرتا تھا۔ مس تلوار تھری ویلر میں نہیں بیٹھتی تھیں کیونکہ اس میں بڑے ہچکولے لگتے تھے۔

میرے سامنے رکشا میں بیٹھی مس تلوار کی شکل تھی جس کو میں نے اچھی طرح سے شال اوڑھا دیا تھا اور نیواری نے رکشا کا ٹپ اونچا کر دیا تھا اور میں نے گیٹ پر کھڑے کھڑے انھیں گڈ نائٹ کہا تھا اور جب نیواری نے رکشا کا پیڈل گھمایا تو انھوں نے رکشا سے باہر جھانک کر کہا۔

"صبح وہ ساڑھیاں ساتھ لے آنا"

"لے آؤں گی مس تلوار۔"

میں پھر گیٹ بند کر کے اندر آگئی تھی۔

اور جب میں نیواری رکشا والے کے چلے جانے کے بعد اپنے آپ کو سنبھال چکی تو مس تلوار کے گھر کی طرف چل پڑی۔

وہی گھر تھا جہاں میں ہر روز جاتی تھی۔ گھر کے گراؤنڈ فلور میں نرسری اسکول تھا جس میں داخل بچوں کو میں بھی پڑھاتی تھی۔ بچے اسکول آنا شروع ہو گئے تھے اور جو بچہ آتا اُسے مِس تلواڑ کی موت کی خبر مل جاتی تھی۔ سبھی بچے اپنے تازہ معصوم چہروں پر گہرے غم کی چھاپ لیے ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چیخ پڑے تھے۔

"آنٹی اِز ڈیڈ میڈم"

"آئی نو چلڈرن" میں نے رندھے ہوئے گلے سے جواب دیا۔ ان معصوم بچوں کو ذرا سا تھپک کر اندر چلی گئی۔ تینوں ٹیچرز آ چکی تھیں اور محلے کی بھی پانچ سات عورتیں فرش پر بیٹھی تھیں۔ میں نے مس تلواڑ کی سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش کے چہرے سے کپڑا ذرا سا سرکایا تو میری چیخ نکل گئی۔ مس تلواڑ رات کی رات میں اس قدر بدل گئی تھیں کہ چہرہ پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔ میں نے ان کا چہرہ ڈھک دیا۔ رومی لاش کے سرھانے بیٹھا رو ئے جا رہا تھا۔

"بے چاری تمہارا گھر بسانے کے خواب دیکھتی رہی عمر بھر" ایک پڑوسی عورت رومی سے بولی۔ "اب تو مس تلواڑ نے زیور اور کپڑے بھی تیار کرانے شروع کر دیے تھے" یہ ایک اور عورت کی آواز تھی۔

اور مجھے ایک دم یاد آیا کہ مس تلواڑ نے کچھ زیور تو میرے گھر میں

پڑی گوڈریج کی الماری میں بھی رکھے ہوئے تھے اور کل شام سترہ سیکٹر سے جو ساڑھیاں لی تھیں وہ بھی تو میرے کمرے کے ایک کونے میں رکھی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں بہت بڑی گناہگار تھی کیونکہ میں نے مس تلواڑ کی اتنی قیمتی چیزیں اپنے گھر میں چھپا رکھی تھیں اور کسی کو ان کی خبر نہ تھی۔

اور جب کچھ دیر کے بعد مس تلواڑ کو بانسوں اور رسیوں کے بنے ہوئے گھٹیا سے تختے پر رکھ دیا گیا تو ان کے جسم پہ ویسی ہی ایک کوری سفید ساڑھی تھی جو وہ اکثر استعمال کیا کرتی تھیں۔ ان کے سفید بالوں سے ڈھکا ہوا بالکل بدلا ہوا سفید چہرہ کتنا عجیب لگ رہا تھا۔ ان کی تمام زندگی کی کمائی اور اتنی بھرپور محنت اور کشمکش کا انعام فقط ایک سفید کوری ساڑھی تھی جس میں ان کی لاش لپٹی تھی۔

اتنے میں بچوں کے پیرنٹس بھی پہنچ گئے تھے۔ اور بچوں کی بھیڑ بھی سامنے کے لان میں جمع تھی اور بالکل خاموش تھی اور سب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی سیلن تھی۔ جب ارتھی کو تھوڑی دیر کے لیے لان میں رکھا گیا تو بچے زور سے چیخ اٹھے۔ جیسے اُن کے کلیجے پھٹ رہے تھے پھر بچوں نے باری باری گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیاں مس تلواڑ کی لاش پر پڑی ہوئی سفید شال پر رکھنا شروع کر دیں۔ یہ انہی پھولوں کی پنکھڑیاں تھیں جو لان میں سے توڑے گئے تھے اور جن میں سے ایک بھی پھول توڑنا مس تلواڑ کو پسند نہیں تھا۔ چادر پر پنکھڑیاں رکھ چکنے کے

بعد بچے بڑے ادب سے قطار میں کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔
جب روی اور کچھ اور لوگوں نے مس تلوار کی ارتھی کو کندھا دے کر ریڈ کراس کی فیونرل وین میں رکھا اور جب اپنی تینوں ساتھی ٹیچرز کے ساتھ لاش کے قریب بیٹھ گئی تو مجھے لگا کہ ایک ہندوستانی عورت کی کل کائنات ایک سادہ سی سفید ساڑھی ہے جو اس کے جنم سے لے کر موت تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ایک سفید ساڑھی ہی ..... اس کی حیات کا کل اثاثہ ہے۔
اور پھر فیونرل وین شمشان کی طرف چل پڑی اور میرے پاس بیٹھا روی پھپھک پڑا۔

کلائمکس

اس کا یہاں سے اچانک چلا جانا بڑا عجیب لگ رہا ہے
کہانی کا جو اسکیچ میرے ذہن میں تھا اور جس طرح سے
کہانی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا یہ کلائمکس ہرگز نہیں تھا۔ کہانی
کے کلائمکس تو خیر کئی ہو سکتے ہیں۔ یہ ٹریٹمنٹ پر منحصر ہے۔ جس طرح
کا ٹریٹمنٹ ہوگا کہانی کا کلائمکس بھی اسی کے مطابق ہو جاتا ہے۔
لیکن اگر بغیر ٹریٹمنٹ بدلے ہی کوئی کہانی کا کلائمکس بدل ڈالے تو
ہم کیا کر سکتے ہیں۔!

بات بڑی سیدھی تھی۔ پرکاشو کی شادی ایک فوجی سپاہی سے
ہوئی۔ فوجی سپاہی چین کے حملے کے دوران لاپتہ ہوگیا۔ قیاس
تھا کہ وہ مارا گیا ہوگا۔ پرکاشو کے کوئی بچہ نہیں۔ وہ سسرال میں
اپنے جیٹھ اور جیٹھانی کے پاس ہی رہتی تھی جو بے اولاد تھے۔
پرکاشو جوان اور بے حد خوبصورت تھی، مگر اس کا جیٹھ رام چند
پچاس کے لگ بھگ تھا اور اس کی بیوی ڈاکٹری علاج سے لے کر

فقیروں کے تعویذوں تک سبھی تدبیریں استعمال کرنے کے بعد اولاد کی امید چھوڑ کر اب دھرم کے کاموں میں لگی رہتی تھی۔ ان حالات میں رام چندا در پر کاشو کے ناجائز تعلقات ہو جانے پر اسے تو کیا ہم محلے والوں کو بھی زیادہ حیرت نہیں تھی۔

لیکن ایک دن اچانک پر کاشو شہر چھوڑ کر چلی جائے گی، اس کا کسی کو بھی گمان نہ تھا۔

شادی کے لیے پر کاشو کا گھر والا دھرم چند دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ ان دو مہینوں میں اس نے پر کاشو کو اس قدر پیار کیا اور اسے اتنا چاہا کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر جا بھی سکتا ہے اور جب ایک رات پر کاشو کو یہ معلوم ہوا کہ دھرم چند اگلی صبح چلا جائے گا تو اس صدمے نے اسے بے ہوش کر دیا اور اس کا خاوند بند کمرے میں اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اسے ہوش میں لاتا رہا اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اس شدت سے اپنے خاوند کے سپرد کر دیا جیسے وہ اپنے انگ انگ پر اس کی شخصیت کی چھاپ لگوانا چاہتی ہو۔ پھر تمام رات جاگ کر پر کاشو نے جب اسے اگلی صبح گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنی غمناک آنکھوں اور رقت بھری آواز سے وداع کیا تو اسے لگا جیسے اس کے تمام جسم میں ایک الاؤ سا جل رہا تھا اور وہ یہ الاؤ لیے اپنے کمرے میں آگئی۔ یہ الاؤ دھیرے دھیرے سلگتا رہا اور پر کاشو اس میں سے

نکلتے دھوئیں سے اپنی لال سُرخ آنکھوں کو سینکتی رہی۔

میں پرکاشو کو بہت زیادہ تو نہیں جانتی تھی، لیکن محلے میں آئی خوبصورت دلہن کو تو تھوڑا بہت سبھی عورتیں جانتی ہیں۔ میں بھی تو دس سال پہلے دلہن بن کر آئی تھی، اس کے بعد اور بھی دلہنیں آتی رہی تھیں لیکن پرکاشو کے آنے سے تو کچھ ایسا ہوا جیسے کوئی کسی تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ـــ بڑا سا پتھر پھینک دے اور سارے کا سارا پانی لرز اٹھے۔ ہلکی ہلکی موجیں اٹھیں اور تالاب کی سطح پر جمی ہوئی سبز سبز کائی کی مہین سی تہہ جگہ جگہ سے پھٹ جائے۔ اتنی تیکھی سندرتا اس محلے میں تھی کہاں۔ اس لیے جس روز پرکاشو آئی سب کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ میں چونکہ فطرتاً حسن پرست ہوں، اس لیے میں نے اسے کئی بار دیکھا اور کئی پہلوؤں سے دیکھا۔ سہاگ رات میں نے بھی دیکھی تھی۔ میرے خاوند نے مجھے بھی بے حد پیار کیا تھا۔ لیکن جانے کیوں میں نے کئی روز تک پرکاشو کو اپنی چھت سے صبح کمرے سے باہر نکلتے ہوتے دیکھا، نہا چکنے کے بعد سج کر ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیکھا اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن جب وہ شام کو دھرم چند کے ساتھ سیر کے لیے گھر سے باہر نکلتی تو میں اسے دیکھتی ہی رہتی، جب تک وہ دونوں گلی کے موڑ سے گھوم نہ جاتے۔ میں اس سے دو ایک بار ملی بھی، باتیں بھی کیں۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی، اس کے بات کرنے کا انداز بھی خوبصورت تھا۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، لیکن ذہین

تھی۔ میں جب کبھی پرکاشو کے بارے میں اپنے شوہر سے ذکر کرتی تو وہ مجھے چڑانے کو کہتے کہ میری سیکس تبدیل ہو رہی ہے اور میں اسی لیے اپنے ہم جنسوں میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگی ہوں سیکس کی تبدیلی کی بات تو مجھے معلوم نہیں اور نہ ہی اپنی ہم جنسوں میں مجھے کوئی غیر معمولی دلچسپی تھی۔ لیکن پرکاشو کے حسن نے مجھ پر ضرور جادو کر دیا تھا اور مجھے اسے بار بار دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ میرے ذہن کی یہ کیفیت کئی روز تک رہی اور پھر ایک روز میں نے دیکھا وہ اپنے کمرے میں دیوار کے ساتھ لگی رو رہی تھی۔ اس نے کواڑ بھی نہیں بھڑائے تھے۔ اس کے سراپا میں وہ چوندھیا دینے والی کیفیت نہیں تھی، شمع کی لو جیسے سرد ہونے کو ہو۔ اس روز پرکاشو اپنے خاوند کو وداع کر کے آئی تھی۔ مجھے لگا جیسے پرکاشو کا حسن جوگن بن چکا تھا۔

رفتہ رفتہ پرکاشو ہمارے محلے کی ایک فرد بن کر رہ گئی اور پرکاشو سے میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی دلچسپی بھی آہستہ آہستہ کم ہو گئی۔ میرے خاوند کو جو میرے سیکس کی تبدیلی کا شبہ گذرا تھا، وہ بھی مٹ گیا۔

پر ایک دن یہ خبر پھیلی کہ پرکاشو کا شوہر لاپتہ ہو گیا۔ اس روز میں اس کے گھر گئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس کی جیٹھانی اسے تسلی دے رہی تھی کہ کچھ دنوں میں دھرم چند کا پتہ لگ جائے گا۔ کئی فوجیوں کا لاپتہ ہو جانے کے بعد بھی تو پتہ لگ گیا تھا۔ مجھے پرکاشو پر بڑا ترس آیا۔

اس دن کے بعد میں نے پرکاشو کو بہت ہی کم گھر سے باہر نکلتے دیکھا
چین کی لڑائی ختم ہو جانے کے بعد کبھی جب دھرم چند کے بارے
میں کوئی خبر نہ ملی تو سب نے خود بخود ہی یہ تسلیم کر لیا کہ دھرم چند
لڑائی میں مارا گیا۔

پرکاشو کی زندگی اس حادثے کے بعد ویران ہو گئی۔ اب
میں نے اسے کبھی کبھار ہی چھت پر آتے دیکھا ہاں کبھی اپنے کمرے میں
نظر آئی تو دھرم چند کی تصویر کے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ میں
جب کبھی اسے دیکھتی مجھے صدمہ ہوتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ پرکاشو صحرا
میں کھلے پھول کی طرح ہے جسے تپتی ہوئی ریت کا کوئی ڈھیر اپنی
لپیٹ میں لے کر ہمیشہ کے لیے ختم کر ڈالے گا۔ میں اکثر سوچتی کہ
اس معصوم جان کا اب کیا ہوگا۔ پھر کچھ مدت کے لیے وہ اپنے
ماں باپ کے پاس چلی گئی۔ سننے میں آیا اس کے والدین اس کی
شادی کر رہے تھے، لیکن پرکاشو نے انکار کر دیا تھا، اور ایک
صبح جب میں جاگی تو دیکھا پرکاشو اپنے کمرے میں کھڑی تھی۔
ایک دم نڈھال اور بے جان۔ ظاہر تھا کہ وہ اس لیے سسرال
آگئی تھی کیونکہ اس کے ماں باپ اس کی دوسری شادی کر رہے
تھے۔

کچھ عرصے کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ ہمارے محلے کی پالیٹکس
میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ محلے کی عورتوں کی سیاستی انچارج مسز

چوپڑہ کی طرف سے کوئی تازہ نیوز بلیٹن ایشو نہیں ہوا۔ بس محلے کی سوشل زندگی اپنی نپی تلی رفتار سے چلتی رہی۔

اور پھر ایک دن اچانک ایک خبر کی پھلجھڑی میرے گھر میں آ گری۔ پرکاشو اور اس کے جیٹھ رام چند میں ناجائز تعلقات کی پھلجھڑی سے ایک دم سناٹا چھا گیا۔ پچاس برس کا رام چند اور بیس بائیس کی پرکاشو۔ کسی نے پرکاشو پر تہمت لگائی، کسی نے رام چند پر، اور کسی نے پرکاشو کی جیٹھانی کو اپنے غصے کا نشانہ بنایا۔ اس خبر کی تصدیق میں یہ بھی کہا گیا کہ پرکاشو اور رام چند کے تعلقات تو دھرم چند کے جاتے ہی شروع ہو گئے تھے لیکن کسی نہ کسی طرح پردہ پڑا رہا، پرکاشو اپنے ماں باپ کے گھر سے اسی لیے تو واپس آ گئی تھی کہ وہ رام چند کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس خبر کا رد عمل ویسا ہی تھا جیسا کہ پرکاشو کے دلہن بن کر آنے پر ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے تالاب کے بندھے ہوئے پانی میں ایک اور بھاری پتھر گرا تھا اور سطح پر جمی سبز کائی کی تہ ایک بار پھر جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی بلکہ اس بار تو کیفیت ایک طوفان جیسی تھی۔ اس طوفان کی لہریں محلے کے ہر گھر کی دیواروں سے ٹکرائیں اور کئی دنوں تک ان کا شور فضا میں ابھرتا رہا۔ نوبت یہاں تک آئی کہ ایک روز میرے خاوند نے بھی مجھ سے کہا۔

"پرکاشو اور رام چند کے تعلقات کا علم اس کی جیٹھانی کو ضرور ہو گا۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں"

"دونوں کو شادی کر لینی چاہیے"

"آپ وکیل ہیں، انھیں یہ مشورہ دے دیں" میں نے جواب دیا۔

جانے کیوں پرکاشو کی یہ حرکت مجھے ناگوار گذری۔ بھاگ جلی نے یہ کیا کر ڈالا تھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ جوان تھی۔ اس کے ماں باپ جب اس کی دوسری شادی کر رہے تھے تو اس نے کیوں انکار کیا تھا۔ اس نے کلنک کی سیاہی کو مانگ کے سیندور پر کیوں ترجیح دی۔ میرے من میں پرکاشو کے خلاف نفرت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ اب میں اسے دیکھتی تو مجھے محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنے حسن کی آنچ سے اپنی تقدیر جلا ڈالی ہو۔

کچھ دن بعد ایسا لگنے لگا کہ جیسے سارے محلے نے پرکاشو اور اس کے جیٹھ رام چند کے ناجائز تعلقات کو تسلیم کر لیا ہو۔ اب ان کے بارے میں کوئی چرچا نہیں تھا، بلکہ ایک دن تو کسی نے یہ خبر بھی اڑائی کہ ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔ پرکاشو کے ماں باپ نے اس سے ہمیشہ کے لیے رشتہ توڑ لیا اور اس کی جیٹھانی پنڈتوں سے شادی کی تاریخیں پوچھ رہی تھی اور چند ہی روز بعد ایک اور پھلجھڑی چھوٹی۔ پرکاشو کے بچہ ہونے والا ہے اور پرکاشو اور اس کا جیٹھ گھر میں میاں بیوی کی طرح رہنے لگے ہیں۔ اب انھیں کسی سے

بھی پر دا نہیں رہا ہے۔

پرکاشو کے بارے میں جب بھی کوئی خبر ملتی مجھے اس پر غصّہ آتا بہرحال اب یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ پرکاشو اور رام چند کے اس غیر سماجی رشتے کو سب نے قبول کر لیا تھا۔ اب میرے کڑھنے یا ناراض ہونے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

ایک بار پھر میرا اپنے خاوند سے جھگڑا ہو گیا۔

"بھائی بڑا خوش قسمت ہے یہ بڈھا، کم بخت نے کمال کر دیا"

"آپ کو کیوں جلن ہو رہی ہے؟"

"پرکاشو دوسری بار بیوہ ہو گئی تو کیا کرے گی بے چاری؟"

آپ نام لکھوا لیجیے ویٹنگ لسٹ میں۔"

"میرا مطلب......"

"خاک ہے آپ کا مطلب" میں نے بات کاٹ دی۔

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ مجھے بھی اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ جانے کیوں مجھے پرکاشو سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ رام چند سے فوراً بیاہ کر لے تاکہ میں ہمیشہ کے لیے اسے اپنی نظروں سے گرا دوں اور پھر کبھی اس کے بارے میں نہ سوچوں۔

لیکن آج صبح اچانک مسز چوپڑہ ہانپتی ہوئی آئی اور بولی۔

"پرکاشو رات گھر سے بھاگ گئی۔"

"لیکن وہ تو شادی کرنے والے تھے۔"

"کون؟"

"پرکاشو اور اس کا جیٹھ۔"

"اور وہ بھاگ گئی اپنے جیٹھ کی دکان پر کام کرنے والے نوکر کے ساتھ ہے۔"

"نوکر کے ساتھ!" میں نے بیچ کر پوچھا۔

"ہاں مسز نلوا ڑ" اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر آؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے مسز چوپڑہ سیڑھیاں اتر گئی۔

اسے اپنا نیوز بابیٹڑ کبھی تو الیشو کرنا تھا۔

اس خبر سے میں ایک دم سن ہو کر رہ گئی۔

اس کہانی کا کلائمکس وہ تو نہیں تھا جو میں نے سوچ رکھا تھا۔

جانے ٹریٹمنٹ کے بدلے بغیر کلائمکس کیوں بدل گیا تھا۔

جانے کیوں!

ہارے ہوئے آدمی

کال بیل کی آواز پر جب میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوبصورت لڑکی جس کی عمر کوئی پچیس برس کے قریب ہو گی کھڑی تھی۔ اس نے بڑے ہی اعتماد بھرے انداز سے نمستے کی۔

"کسے ملنا ہے آپ کو"؟

"آپ ہی سے"

"اندر آ جائیے"

"نہیں ٹھیک ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں رمیش کی بیوی ہوں" اس نے دروازے کے باہر کھڑے کھڑے کہا۔

"کون رمیش"

"جو میرا خاوند ہے"

"یہ تو میں سمجھ گیا لیکن یہ ہے کون شخص" میں نے پوچھا۔

"وہ جو سامنے کے کوارٹروں میں کپڑے پریس کرتا ہے" اس نے پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

"مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟ میں نے اس سے پہلے کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔"

"اس سے پہلے تو شاید میرے خاوند نے بھی مجھے نہیں دیکھا۔ وہ آج شام کو میرے ساتھ دہلی جا رہا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

"مگر کیوں"؟

"اس لیے کہ وہ میرا خاوند ہے اور مجھے اس کی ضرورت ہے"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں اس میں"

"اس کا حساب کر دیں میں سبھی کوٹھیوں سے اس کا اکاؤنٹ صاف کر رہی ہوں۔ کیونکہ وہ خود نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ ایکدم پھوندو ہے۔"

"تو آپ ماں جی سے مل لیجیے ان کو پریس والے کا حساب معلوم ہو گا۔"

"شاید آپ کو معلوم نہیں میرا خاوند پریس والا نہیں، چنڈی گڑھ میں ایک بڑے دفتر میں اسسٹنٹ ہے اچھا میں ماں جی سے مل لیتی ہوں"

وہ مسکراتی اور پھر اپنی ساڑھی کے پلو کو سنبھالتی ہوئی کوٹھی کے پچھواڑے میں چلی گئی جہاں ماں دھوپ میں بیٹھی میری قمیضوں میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ میں اندر کمرے میں آگیا اور پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ اس فتنہ گر عورت کے بارے میں اور اس کے خاوند کے متعلق بھی۔

رمیش پچھلے چار برس سے سامنے کے چھوٹے ٹائپ کے کوارٹروں

کے ایک کوارٹر کے برآمدے میں لکڑی کی چھوٹی میز بچھائے دن بھر
ارد گرد کی کوٹھیوں اور کوارٹروں سے اکٹھے کیے ہوئے کپڑے پریس
کرتا رہتا تھا۔ اسے اس برآمدے کے استعمال کے لیے کوارٹر میں رہنے
والے ایک ہیڈ کلرک کے دس افراد پر مشتمل کنبے کے کپڑے پریس کرنے
ہوتے تھے۔ اور اس کی ایک بڑی ہی پیاری سی لڑکی کو سائیکل پر
بٹھا کر صبح اسکول چھوڑنے جانا ہوتا تھا۔ واپس وہ بس سے آجایا
کرتی تھی۔ رمیش کے بارے میں مجھے کبھی کبھار ماں سے بات کرتے
ہوئے جو واقفیت حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ رمیش پٹیالہ کے
قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ جہاں اس کی بوڑھی ماں
اور چھوٹی بہن رہتی تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور گاؤں کے کچے
مکان لیکن زمین کے چھوٹے سے زرخیز ٹکڑے کے لیے اپنے چاچا
سے اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ دن رات پریس کی میز کے سامنے
کھڑے رہ کر اور گرم کوئلوں کی تپش سے جل کر جتنی رقم وہ بچا
سکتا تھا اپنے مختصر سے کنبے اور مقدمے پر خرچ کرتا تھا۔ رمیش
نہایت ہی کم گو تھا اور ہمیشہ ہی بڑے ادب سے پیش آتا تھا کہیں
راستے میں اس سے ملاقات ہو جاتی تو وہ سائیکل سے اُتر جاتا اور
بڑی مخلص مسکراہٹ سے سلام کرتا۔ اس سے زیادہ مجھے اُس کے
بارے میں واقفیت نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی اتنی خوبصورت
بیوی تھی اور وہ دہلی میں رہتی تھی۔ میں نے پچھلے چار برسوں میں پہلی بار

اسے دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پلنگ پر پڑے پڑے ہی کھڑکی سے دیکھا وہ کافرہ بڑے اعتماد بھرے قدموں سے پچھواڑے سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور پھر وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں باہر گیا۔ ماں اب بھی میری قمیضوں میں بٹن ٹانک رہی تھی۔

"کب تک بٹن ٹانکتی رہو گی میری قمیضوں میں ؟"

"جب تک یہ ٹوٹتے رہیں گے۔"

"کب تک ٹوٹتے رہیں گے یہ بٹن ؟"

"جب تک تم اپنی چیزوں کی سنبھال نہیں کرو گے۔"

"اور میں کب تک سنبھال نہیں کروں گا ؟"

"جب تک تمھیں عقل نہیں آئے گی۔"

"یہ ہوئی نہ بات"۔ میں نے کہا اور پھر میری ماں مسکرا دی میری ماں کی مسکراہٹ بڑی روشن اور پوتر اور پیاری ہے۔ میری ماں جوانی کے دنوں میں بڑی خوبصورت تھی۔ میں نے اس کی تصویر کا ایک انلارجمنٹ اپنے سونے والے کمرے میں لگا رکھا ہے۔ میری بات سن کر ماں نے عینک اتار دی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"وہ کپڑے پریس کرنے والا رمیش چنڈی گڑھ چھوڑ کر جا رہا ہے۔"

"اچھا ہوا کم بخت قمیضوں کے بٹن بہت توڑتا تھا۔"

ماں نے میرے جواب کی طرف توجہ نہیں دی بولی۔

"اس کی گھر والی حساب کرنے آئی تھی اب اسے دہلی لے جا رہی ہے۔ وہاں وہ کسی اسپتال میں نرس ہے۔ اس کے باپ اور بھائی کا اپنا کاروبار ہے۔ بیچ میں اُن کا آپس میں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ لیکن اب صلح ہو گئی ہے۔ وہ اسے منانے آئی تھی اب وہیں اسے نوکر کروا دے گی۔"

ماں کتنی جذباتی ہو رہی تھی یہ سب کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بڑا برا لگ رہا ہے رمیش کا جانا، بہت اچھا لڑکا تھا۔"

پھر اس نے اپنی سفید ساڑھی کے آنچل سے اپنی نم ناک آنکھیں سکھا ڈالیں۔

"تمھیں معلوم تھا کہ رمیش شادی شدہ ہے؟"

"اس نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ تو جب بھی بات کرتا اپنی بوڑھی ماں اور جوان بہن، اور زمین کے مقدمے ہی کی بات کرتا اپنی گھر والی کی بات تو اس نے کبھی کی ہی نہیں۔"

"کوئی پچھلے بازی ہو گی؟"

"بھگوان جانے"

"جو باتیں انسان جانتا ہے وہ بھگوان بھی نہیں جانتا۔ وہ بیچارہ تو بڑے شریف اور بھلے آدمی کی طرح آنکھ نیچی کیے پڑا رہتا ہے"

"بھگوان سے نہ جانے تمھیں کیوں اتنی چڑ ہے۔"

"مجھے سبھی بھلے لوگوں سے چڑھ ہے۔ انہی کے کارن تو اتنی خوبصورت عورتوں کے خاوند رات دن دوسروں کے کپڑے پریس کرتے ہیں۔"

"اچھا بابا میں ہاری۔ جب اس نے کبھی مجھ سے اپنی گھر والی کی بات نہیں کی تو میں کیا کروں؟"

"تم اپنی عینک مجھے دو کہ اندر رکھ دوں اور تھوڑی دیر آرام کر لو۔"

میں ماں کی عینک اور ڈھیر ساری قمیض جو چارپائی پر پڑی تھیں اٹھا کر اندر لے گیا اور ماں کو تکیہ دے کر اسے لٹا دیا۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس نے آرام کیا یا یوں ہی پڑی رہی۔ رمیش کی کافرادا بیوی واقعی اسے ساتھ لے گئی کیوں کہ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔

دو دن کے بعد ہیڈ کلرک کے کوارٹر کے باہر اس میز پر اور اسی پریس سے جس سے رمیش پریس کیا کرتا تھا ایک اور آدمی نے کپڑے پریس کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن میں نے ہیڈ کلرک کی اس پیاری سی لڑکی کو اس نئے پریس کرنے والے کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے نہیں دیکھا اب شاید وہ بس ہی سے اسکول جاتی تھی۔

یہ نیا آدمی جسے رمیش اپنا سامان بیچ گیا تھا۔ یو۔ پی کے ضلع بستی کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور ٹھیٹھ پوربی زبان بولتا تھا وہ کئی سال تک بمبئی کے ماہم ایریا میں کپڑے پریس کرتا رہا تھا۔ لیکن وہاں اس کا کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی اور وہ بے چارہ اس دھمکی سے ڈر کر بمبئی چھوڑ آیا تھا۔

اس کا نام ماتا دین تھا اور وہ بمبئی چھوڑنے کے بعد چھ سات مہینے ادھر ادھر دھکے کھاتا رہا تھا۔ اور اب پچھلے ایک مہینے سے چنڈی گڑھ آگیا تھا۔ یہاں اس کے گاؤں سے نزدیک کے کچھ آدمی رکشا چلاتے تھے. آیا تو تھا وہ رکشا چلانے لیکن اسے یہ کام پسند نہیں آیا اور پھر اس کی ملاقات اچانک رمیش سے ہو گئی جو اپنا سامان اسی دن بیچ کر دہلی چلا جانا چاہتا تھا۔ ماتا دین کے پاس رقم نہیں تھی۔ وہ رقم اس کے دوستوں نے آپس میں اکٹھی کر کے اسے دے دی اور ماتا دین رمیش کے اس اڈے کا مالک بن گیا، جہاں دو چار سال تک مردوں عورتوں اور لڑکیوں کے کپڑے پریس کرتا رہا تھا اور اس نے کبھی کسی کپڑے کو زیادہ سینک نہیں لگنے دیا تھا۔

کچھ روز تو ماں رمیش کو یاد کرتی رہی لیکن پھر ماتا دین نے اپنے پوربی لہجے اور دھرم کرم کی باتیں کر کے ماں کو اپنا سپورٹر بنا لیا اور دیکھا دیکھی سب گھروں نے ماتا دین ہی کو کپڑے پریس کرنے کے لیے دینے شروع کر دیے اور اب ماتا دین اپنے ہاتھوں پر پریس کیے ہوئے کپڑے پھیلاتا گھر گھر بانٹتا پھرتا اور جب موقع ملتا اپنی ہتھیلی پر تھوڑا سا چونا اور زردہ تمبا کو مسلتا اور پھر اسے پھانک جاتا یہ سلسلہ کوئی دو ماہ تک چلتا رہا۔

اور پھر ایک دن میں جب دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر برآمدے میں آیا تو رمیش کھڑا تھا۔

"ارے تم"

"نمستے"

"کہو کب آئے؟"

"کل شام آیا تھا"

"مزے میں ہو"

میرے اس سوال پر وہ بھبک کر رو پڑا۔

"ارے کیا ہوا بھائی؟"

"کچھ نہیں"

"ماں رمیش آیا ہے اِسے چائے وائے پلاؤ۔ میں دفتر جا رہا ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے!"

میں دفتر چلا گیا اور دِن بھر اتنا مصروف رہا کہ یہ بھی بھول گیا کہ میں صبح رمیش سے ملا تھا اور وہ میرے ایک سیدھے سادے سوال پر رو پڑا تھا۔

اس شام میرے کچھ ملنے والے آگئے اور میں انھیں میں الجھا رہا۔ کہیں رات کو جا کر جب میں سونے سے پہلے حسب معمول کتاب لیے بستر پر لیٹا تھا تو ماں آکر میری پائنتی پر بیٹھ گئی۔

"رمیش کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا بیٹا"

میں نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کروٹ لی "کیا ہوا رمیش کو؟"

"اس کی بیوی بڑی مکّار اور آوارہ قسم کی عورت ہے۔ وہ پتہ نہیں کہاں کہاں جھک مارتی رہی اور اپنے ماں باپ سے یہ کہتی رہی کہ وہ ہر مہینے رمیش کو ملنے چنڈی گڑھ آتی تھی اور گھر کے لوگ اس پر اعتبار کرتے رہے۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ اس میں گھپلا بازی ہے۔"

"اور جب اس کے ہاں لڑکا ہوا تو وہ رمیش ہی کا لڑکا بتایا گیا۔"

"حالانکہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔"

"وہ تو کہتا ہے کہ میں نے پچھلے دو سال سے اپنی بیوی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"لڑکے کے نام کرن سنسکار کی رسم تھی۔ گھر والوں نے رمیش کو بلانے کے لیے کہا تو اس کی بیوی نے جواب دیا کہ وہ چنڈی گڑھ میں جا کر اسے ساتھ لے آئے گی ورنہ وہ نہیں آئے گا۔"

"کیوں؟" میں ہمہ تن گوش تھا۔

"اس چالاک عورت نے جانے کس طرح سے جال پھیلایا کہ رمیش بیچارہ اس میں پھنس گیا اور اپنا سب کچھ بیچ باچ کر اس کے ساتھ دہلی چلا گیا۔ وہاں جا کر اسے صحیح حالات معلوم ہوئے تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہاں اس کی بیوی اور اس کے گھر والوں نے سب سے

یہی کہہ رکھا تھا کہ رمیش چنڈی گڑھ میں کسی دفتر میں اسسٹنٹ تھا اور مشکل سے ایک دن کے لیے آیا تھا۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کہہ رہی تھی " جب رمیش نے لڑکے کا باپ ہونے سے انکار کیا اور بتایا کہ اس کی بیوی آج تک ایک بار بھی اسے ملنے چنڈی گڑھ نہیں آئی تھی تو اس کے دونوں ہٹے کٹے سالوں نے اس کی مشکیں کس دیں اور اسے خوب پیٹا اور اسے کہا اگر اس نے یہ بات کسی سے کہی اور لڑکے کے نام کرن سنسکار کی رسم میں کوئی اڑچن ڈالی تو وہ اسے جان سے مار ڈالیں گے۔"

"اور پھر لڑکے کا نام رکھ دیا گیا اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ رمیش اس کا باپ تھا۔ کیونکہ اس کی جان خطرہ میں تھی اور وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔" میں نے ٹوکا۔

"یہ سب میں نہیں جانتی" ماں نے کہا

"لیکن میں جانتا ہوں اس حرام زادی کو اپنے ناجائز بچے کے لیے باپ کی ضرورت تھی اور رمیش کو اپنی جان پیاری تھی۔ یہ ایک طرح کی سودا بازی تھی اس نے اپنے حرامی بچے کے لیے باپ حاصل کر لیا اور رمیش نے اپنی جان بچا لی اور اپنی جان کو بچاتا ہوا دہلی سے بھاگا اور یہاں پہنچ گیا۔ سودا کامیاب رہا۔" میں نے غصہ سے کہا۔ اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"کتنے بزدل لوگ ہیں دنیا میں" ماں بولی۔

"لیکن سماج کا سارا ڈھانچہ انہی کے ہاتھوں میں ہے ان کی وجہ سے جانے کتنے بچے گن گن آنگنوں میں کھیل رہے ہیں۔ اور کتنی مائیں اپنے سینوں میں حقیقی باپوں کے نام کی چتائیں سلگائے خاموش جل رہی ہیں۔"

رمیش یہیں رہنا چاہتا ہے اس کی مدد کرو بیٹا۔"

یہاں سے تو وہ اپنا اڈا اٹھا چکا ہے۔ اجڑا ہوا اڈہ۔ کبھی دوبارہ بسا بھی ہے۔ یہ ماتادین بھی شاید اسی طرح اڈا اکھاڑ کر آیا ہے۔ کون جان سکتا ہے کسی کے بارے میں۔"

"لیکن اس کے لیے کچھ تو کرو۔"

"وہ تو ایک دفتر میں اسسٹنٹ ہے ہی اور کیا چاہیے اُسے؟"

"یہ سب تو جھوٹ ہے۔ اس کی بیوی نے ویسے ہی بات پھیلا رکھی تھی۔"

"تو سچ کیا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں یہ سچ جھوٹ کا چکر۔ تمہیں چلائے پھرتے ہو۔" ماں بولی۔

"سچ یہ ہے کہ رمیش ایک حرامی بچے کا قانونی طور پر باپ ہے اور اسکول کے رجسٹر میں اسی کا نام بطور باپ لکھا جائے گا۔ اور یہ بھی

سچ ہے کہ اس کی بیوی اور اس کے گھر والے سبھی اس سازش
میں شریک ہیں "

"لیکن اس میں بے چارے رمیش کا کیا قصور ہے"

"اس کا قصور یہ ہے کہ وہ ایک شریف ایمان دار اور غیور انسان
ہے اور شرافت۔ ایمان داری اور غیرت سے زندہ رہنا چاہتا ہے"۔

ماں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پائنتی سے اٹھی
اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یہی تو ایک سوال ہے جو
پھانسی کی ڈوری کا پھندہ بن کر جانے کتنے ہی لوگوں کا گلا گھونٹ
رہا ہے۔ اور اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا۔

جن کے پاس اس سوال کا جواب ہے ان کی زبانیں گنگ ہیں
جب تک ان کی زبان کھلے گی یہ سوال ایک بوڑھے بڑ کے پیڑ کی
طرح بے ترتیبی سے پھیل چکا ہوگا اور اس کی جڑوں سے ہزاروں
سوال کونپلیں بن کر پھوٹتے رہیں گے۔ اور دھرتی کا رس چوستے
رہیں گے۔

یہی بات سوچتے سوچتے میں دیر تک جاگتا رہا اور جب سویا
تو بجلی بھی نہ بجھا سکا۔ جانے رات کے کس پہر میں ماں نے سوئچ آف
کیا ہوگا۔

اگلی شام دفتر سے واپس آکر باہر لان میں ماں کے ساتھ چائے

پی رہا تھا کہ رمیش اور ماتا دین دونوں آ گئے۔ ان دونوں نے مجھے اور
ماں کو نمستے کی اور ہمارے قریب ہی لان پر بیٹھ گئے۔

"کہو کیسے ہو رمیش؟"

"آپ کی مہربانی ہے سر" وہ اپنی گفتگو میں "سر" کا اکثر استعمال کیا
کرتا تھا۔

"اور تم ماتا دین"

"آپ کی مہربانی ہے جناب"

"تمھارا کام جم گیا ہوگا اب تو؟" میں نے پوچھا۔

ماں اتنی دیر میں اُٹھ کر دونوں کے لیے چائے بنا لائی تھی۔
دونوں نے اپنے گلاس گھاس پر لگا دیے تھے۔

"میرا کام تو جم گیا صاحب لیکن رمیش کا بگڑ گیا۔"

"کیسے"

"اس نے اپنا اڈّا بیچ دیا۔"

"اور تم نے خرید لیا۔"

"جی صاحب"

"اور اب تم اسے دوبارہ بیچ دو۔"

"یہی میں بھی اس کو کہہ رہا ہوں" رمیش اتنی دیر کے بعد اب بولا تھا۔

"کیوں ماتا دین؟"

"یہ اب کیسے ہو سکتا ہے صاحب"

"ہو کیوں نہیں سکتا اب تمھاری جگہ پر رمیش کپڑے پریس کرے گا اور اپنی اجرت لے گا۔"

رمیش نے بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔

"ارے تم لوگ چائے پیو" ماں نے دونوں کو مخاطب کیا۔

دونوں نے اپنے اپنے گلاس ہونٹوں سے لگا لیے۔

"رمیش کی گھر والی آوارہ ہے اور میری گھر والی کو میرا بھائی بھگا لے گیا ہے۔ ہم دونوں کا جھگڑا ایک سا ہے۔" ماتا دین نے کہا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے اڈے کے بارے میں؟" میں نے سوال کیا۔

"اسی کے لیے تو میں ماتا دین کو آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔ آپ اِسے سمجھائیں" رمیش نے بڑی عاجزی سے مجھے مخاطب کیا۔

"بھائی یہ تمھارا آپسی معاملہ ہے میں اس میں کیا کر سکتا ہوں"

"لیکن سر آپ ہمیں کوئی راستہ تو سمجھا سکتے ہیں" رمیش نے کہا۔

"آپ جو فیصلہ کریں گے ہم دونوں کو منظور ہو گا" ماتا دین نے تائید میں کہا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ تم دونوں یہ اڈا چھوڑ دو اور چنڈی گڑھ سے بھاگ جاؤ؟"

ہم تو صاحب چلے جائیں گے لیکن آپ کو جو صبح شام اپنی پتلونوں کی

گریزیں اور قمیضوں کے کالر ٹھیک کرانے ہوتے ہیں وہ کون کرے گا؟
ماتا دین نے سوال کیا۔

"یہ خود کر لیا کریں گے" ماں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"تو پھر کیا کیا جائے صبح شام تو کالر اور گریزیں مجھ سے کبھی درست نہیں ہوں گی۔ لیکن رمیش تو ٹھیک آدمی نہیں ہے یہ قمیضوں کے بٹن بہت توڑتا ہے۔

"اور میں صاحب"

"تم میرے پاجامے ہمیشہ ہی غلط پریس کرتے ہو"

میں نے سگریٹ سلگایا اور دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ رمیش اور ماتا دین دونوں دو ہارے ہوئے آدمیوں کی طرح میری طرف پُر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"تو پھر یہ بے چارے کریں کیا؟" ماں نے ان کی طرف داری کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا ایک حل ہو سکتا ہے آئندہ سے قمیض تو ماتا دین پریس کیا کرے اور پاجامے رمیش"

"اسی اڈے پر" ماں بولی۔

"اسی پریس سے اور اسی میز پر لیکن مختلف وقتوں پر۔ ایک پریس کرے گا تو دوسرا کھونٹیوں سے کپڑے اکھٹے کرے گا۔ ایک پریس کیے ہوئے کپڑے تقسیم کرے گا تو دوسرا رقم اکھٹی کرے گا اور پھر آدھی

آدھی رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔"

"یہ آپ نے ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا ہے" رمیش نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں یہاں سے اب کہیں نہیں جانا چاہتا۔"

"ہم دونوں اکیلے ہیں۔ جتنا کمائیں گے اسی میں گزارہ کریں گے۔ نہ اب مجھے کچھ اپنے گھر بھیجنا ہے نہ رمیش کو" ماتا دین نے جواب دیا۔

"لیکن رمیش کی ماں اور بہن بھی تو گاؤں میں رہتی ہیں اور اس کی زمین کا بھی تو جھگڑا چل رہا ہے" ماں نے انٹر دین کہا۔

رمیش نے سوال بھرے انداز میں ماتا دین کی طرف دیکھا۔

"ہم دونوں کے گزارے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ ہم ہر مہینے رمیش کی ماں کو بھیج دیا کریں گے۔"

ماتا دین بولا۔

"اور وہ مقدمہ؟"

"اب اسے وکیل کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کچہری میں اب میں وکالت کیا کروں گا اس کی۔"

ماتا دین کا جواب سن کر میں زور سے ہنسا میری ہنسی میں ماں کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔ اور دونوں ہارے ہوئے آدمیوں کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور بے لوث مسکراہٹ پھیل گئی۔

ہیرو انکل

بات جتنی مختصر ہے اتنی ہی تلخ بھی ہے۔
اسی لیے میں بنا کہے نہیں رہ سکتی۔
بات یہ ہے کہ میرا ایک ہیرو تھا۔
اور آج میرا ہیرو مات کھا گیا ہے۔
میں جب شادی کے بعد اس شہر میں آئی تو دیکھا کہ میرا خاوند ایک معمولی قسم کے مکان میں رہتا تھا، محلہ بھی خاص اچھا نہ تھا لیکن میرے خاوند کو یہ مکان پسند تھا۔ اس کی اس نے دو وجہیں بتائیں، پہلی وجہ یہ کہ مکان کا کرایہ واجبی تھا اور اس کرائے پر ایسا مکان ملنا ناممکن تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اوپر والی منزل میں جو فیملی رہتی تھی وہ بہت اچھی تھی۔ آدمی کسی دفتر میں سپرینٹینڈنٹ تھا اور اس کی ۳ خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ اور ان لڑکیوں کی ماں بڑی ہنس مکھ اور ہمدرد قسم کی تھی۔ پہلی وجہ کے بارے میں جاننے کے لیے تو کچھ سمے لگا لیکن اوپری منزل کی فیملی کے بارے میں مجھے اس مکان میں جانے کے دوسرے دن ہی اندازہ ہو گیا۔ معلوم تو در اصل پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن میں اکھڑے ہوئے پودے کی طرح مرجھائی ہوئی تھی اور اپ سیٹ ہونے کے ہلکے ہلکے کرب سے گذر رہی تھی۔ اس نئے نئے ماحول کی جزئیات

کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔

ہم شام کو پہونچے تھے اور میرے خاوند نے اوپر کی منزل پر جانے والی سیڑھیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور لمحہ بھر میں آٹھ، نو برس کی ایک گوری چٹی لڑکی چابی لے کر نیچے آ گئی تھی۔

"بھائی صاحب آ گئے آپ؟"

"ہاں رنجو۔"

"تمہاری بھابی ہیں۔"

وہ لڑکی ہمارے مکان کا تالا کھول رہی تھی۔ اس نے چابی تالے میں چھوڑ دی۔ اور مجھے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ میں مسکرا دی۔ چابی تالے میں سے نکل کر نیچے گر گئی۔ جسے اس نے اٹھا کر دوبارہ تالے میں لگا دیا۔

میں جب اپنے خاوند کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے کئی روز تک بند رہنے کے بعد بھی وہ صاف ستھرا تھا۔

"آپ کا نوکر بہت سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے ہی نوکر سمجھ لو، سمجھدار آہستہ آہستہ ہو جاؤں گا۔"

"تو یہ گھر کس نے سجا رکھا ہے؟"

"اوپر والی آنٹی نے۔ بہت اچھے لوگ ہیں یہ، ورنہ یہاں تو کوئی کسی کو پہچانتا بھی نہیں۔"

میں نے اپنی طرف سے کوئی کمنٹ نہیں کیا۔ صوفے میں بیٹھ کر پرس میں رومال ڈھونڈنے لگ گئی۔ شاید یہ میری ذہنی کنفلکٹ کا سمبل تھا۔

اور جبھی رنجو اور اس کے ساتھ اس سے کوئی تین برس بڑی ایک اور لڑکی چائے کا سامان لے کر آ گئی۔

"نمستے" اس نے ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یہ جمنا ہے، میری دوسری بھتیجی۔ لیکن یہ مجھے بھائی کہہ کر پکارتی ہیں۔ انکل کہہ کر مخاطب نہیں کرتیں۔"

"کتنی بھتیجیاں ہیں آپ کی؟" میں نے جمنا کے ہلکے بلو رنگ کے اسکرٹ اور اس کی گوری گوری پنڈلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تین" میرے خاوند نے تین انگلیاں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ تپائی پر چائے رکھ کر جمنا اور رنجو بھاگ گئیں اور میں نے سفر کے بعد اپنے تھکے ہوئے جسم کو راحت دینے کے لیے چائے کی دو گرم گرم پیالیاں پیں اور دوسری پیالی کے ساتھ سارپڈون کی ایک ٹکیہ بھی لی۔ سر میں تیز درد ہو رہا تھا۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ میں کب پلنگ پر گری اور کب سو گئی۔ رات کے کسی پہر جب میری آنکھ کھلی تو میرے خاوند میرے گالوں کو آہستہ آہستہ سہلا رہے تھے۔

اگلے دن بریک فاسٹ ہمیں اوپر جا کر لینا تھا ہم تیار ہو کر ذرا دیر سے اوپر گئے۔

سب سے پہلے جس سے میری ملاقات ہوئی وہ آنٹی تھی۔ بڑے ہی تیکھے نقوش، دراز قد کی ایک ادھیڑ سی عمر کی عورت جو سفید ساڑھی میں اور بھی گوری لگ رہی تھی۔ اس کے دانت بے حد چمکیلے تھے۔ مجھے زیادہ سفید

دانتوں والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ کیونکہ میرے اپنے دانت میلے ہیں۔ لیکن سفید دانتوں کے باوجود وہ عورت بڑی پرکشش تھی۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر میرا ماتھا چوم لیا۔ میں شرما گئی۔

"ارے آپ تو شرما رہی ہیں۔" یہ تھی انورادھا، جمنا اور رنجو کی تیسری بہن جوانی کی حدوں کو چھوتی ہوئی ہیرے اور سیندور کی ایک مورت۔

یہ سن کر تینوں لڑکیاں کھکھلا کر ہنس پڑی اور میرے اوپر والے ہونٹ کے لوؤں پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

اور ابھی ہم کھلی چھت پر کھڑے ایک دوسرے کو پہچان ہی رہے تھے کہ چالیس سے کچھ اوپر کا ایک آدمی جیک کی بشرٹ پہنے لمبے لمبے کالے بالوں میں سیدھی مانگ نکالے اسمارٹ قسم کی پینٹ میں بائیں جیب میں ہاتھ اڑسے سگریٹ کا ڈھیر سا دھواں اگلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا۔

"ہماری بات کا النگھن کر دیا تم نے اسناد ہ؟" اس نے میرے خاوند کو مخاطب کیا اور پھر قریب آکر اسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔

"آپ نے شروع کر دیا اپنا لیکچر،" آنٹی مسکراتی ہوئی بولیں۔

"کوئی بھی کنوارا میری بات کو نہیں مانتا اور بعد میں پچھتاتا ہے۔"

میں اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ آدمی کسی دفتر میں معمولی سپرنٹنڈنٹ ہو سکتا ہے۔

"ادھر آؤ، ہمارے انکل سے ملو۔"

میں ہچکچاتی ہوئی سی آگے بڑھی اور میری پازیب کے گھنگرو بج اٹھے

اور جب میں قریب پہونچی تو اس آدمی نے میرے کندھے پر بڑے ہی اپنے پن سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ونود بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ تمہاری عمر کی میری کوئی لڑکی ہوتی تو میں اسے اپنا داماد بنا لیتا۔"

میں جھینپ گئی۔ میرے خاوند کی یہ تعریف کتنی بھرپور تھی لیکن کتنی اسنگت۔ اور پھر مجھے میری پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر چائے کی میز تک لے گیا۔ اور اپنے ہاتھ سے میرے لیے چائے بنائی۔

"میں نے شکر نہیں ڈالی، میں شکر نہیں پیتا حالانکہ مجھے ڈائیبٹیز نہیں۔"

چائے میں شکر آنٹی نے ڈال دی۔

"یہ تو بس ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔"

اور ہونٹوں سے پیالی لگاتے ہوئے میں نے سوچا کاش آنٹی اس میں شکر نہ ڈالتیں۔ کتنی لذیذ، گرم اور اسٹرانگ چائے تھی۔ بالکل میری پسند کی۔ چائے کے دوران اس آدمی نے اتنے پیارے پیارے لطیفے اور اتنی خوبصورت باتیں کیں اور اتنے ڈھیر سارے سگریٹ اپنے چمکتے ہوئے گیس لائٹر سے جلائے کہ بس لطف آ گیا۔

جب ہم سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے تو اس نے کہا۔

"اب تم دونوں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ تین چار دن تک ہم میں سے کوئی بھی مخل نہیں ہوگا۔ ہاں اگر کہیں جھگڑے کی نوبت آ جائے تو مجھے فون"

بلا لینا "

اس نے پہلی سیڑھی پر کھڑے مجھے بڑے ہی خلوص سے دیکھا اور جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا ،

"بہت اچھا ہیرو انکل "

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ رنجو ، جمنا اور انورادھا نے تالیاں بجانا شروع کر دیں اور تالیوں کی اس لے کو سنتے ہوئے میں اور ونود نیچے اتر گئے ۔

ونود کی کتنی گہری انڈر اسٹینڈنگ تھی اس فیملی سے ، یہ مجھے دھیرے دھیرے معلوم ہو گیا ۔ مجھے کچھ شاپنگ کرنا تھی ۔ میں نے ونود سے ذکر کیا تو جواب ملا ۔

"آنٹی کے ساتھ چلی جانا ۔ بہت اچھی شاپنگ کرواتی ہیں ۔ شادی کے لیے میری تمام شاپنگ آنٹی ہی نے کرائی تھی "

میں نے پکنک پر چلنے کو کہا تو بولے ۔

" انکل سے بات کرنا سب انتظام کر دیں گے "

کمرے کی سیٹنگ بدلنے کی بات کی تو کہنے لگے ۔

" رنجو ، جمنا اور انورادھا کو اپنے ساتھ لگا لو ، فرسٹ کلاس سیٹنگ ہو جائے گی " اور پھر میں نے چڑ کر کہا ۔

" اگر سب کام انہی لوگوں کو کرنا ہیں تو تم کیا کرو گے ؟ "

" بس سپر وائز کروں گا " ونود نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔

اگر میری جگہ کوئی کم پڑھی لکھی اور ایڈجیسٹمنٹ نہ کر سکنے والی لڑکی ہوتی تو اس کا اپنے خاوند سے جھگڑا ہو جاتا اور اس زمانے میں جب جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں تو انھیں ختم کرنے کے سادھن نہیں سوچے جاتے بلکہ انھیں شدید کرنے کے طریقے سوچے جاتے ہیں اور اسی لیے بہت سی بظاہر کامیاب ازدواجی زندگیاں در اصل بڑی تلخ اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں اور صرف دنیا والوں کو ہی خوشگوار نظر آتی ہیں۔

ہیرو انکل واقعی چار روز تک نظر نہیں آئے۔ ان کی ہدایت پر سوائے ان کے کسی اور نے عمل نہیں کیا۔ آنٹی سے ہر روز ملاقات ہوتی، لڑکیاں روز میرے پاس بیٹھی رہتیں۔ لیکن ہیرو انکل جانے کہاں غائب رہے۔ پانچویں روز شام کو دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے آج پھر سر درد کا دورہ تھا اور برا حال تھا بال بکھرے ہوئے، چہرہ تھکا ہوا، آنکھیں چڑھی ہوئی، دروازہ کھولا تو سامنے ہیرو انکل کھڑے تھے۔ میری یہ حالت دیکھ کر بولے۔

"کسی ٹریجک سین کی ریہرسل ہو رہی ہے کیا؟"

"نہیں ہیرو انکل"

"تو، کیا بات ہے؟"

"آج ہیروئن کے سر میں درد ہے"، یہ کہتے ہوئے میں اندر آگئی اور ہیرو انکل نے مجھ سے لیٹ جانے کو کہا اور میرا سر دبانا شروع کر دیا۔ کتنی راحت ملی تھی مجھے۔

"ہیرو انکل آپ کتنے اچھے ہیں۔"

"سبھی ہیرو اچھے ہوتے ہیں۔ ہیرو برا ہو ہی نہیں سکتا۔" انھوں نے زور کا قہقہہ لگایا اور پھر چمکتے ہوئے گیس لائٹر سے سگریٹ سلگا کر کرسی سے اٹھ پڑے۔

"میں چائے بھجواتا ہوں۔"

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد الوزا دھا چائے لے کر آگئی۔ میں نے ساریڈون کی ٹکیا لی اور ونود کے آنے تک میرا ٹریجک رول ختم ہو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر شگفتہ اور تازہ دم ہو چکی تھی۔

پکنک پر جانے کی میری ضد آخر پوری ہو گئی۔ ہیرو انکل نے سب انتظامات کر دیئے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں ریزرویشن کرا لی تھی۔ جانے کے لیے کسی دوست کی کار بھی لے لی تھی۔ آنٹی تینوں لڑکیاں، ونود، میں اور ہیرو انکل سبھی اکٹھا تھے۔ کھانے پینے کا سارا سامان ہم نے ساتھ لے لیا تھا۔ شہر سے دس میل دور گرم پانی کا ایک چشمہ تھا جس کے پانی کو ایک بہت ہی خوبصورت سوئمنگ پول میں جمع کیا گیا تھا۔ گرم گرم پانی جس میں سے ہلکی ہلکی بھاپ نکلتی تھی بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ کئی اور لوگ بھی پکنک کے لیے گئے ہوئے تھے۔ دو ایک فیملیز ہیرو انکل کی واقف بھی تھیں۔ ان سے بھی انھوں نے ہمیں ملوایا لیکن بیٹھنے کے لیے اپنا اڈہ الگ ہی جمایا۔ دریاں بچھا کر سب درخت کی چھاؤں میں گھاس پر بیٹھ گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں نہیں گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیرو انکل سوئمنگ کا سٹیوم پہن کر سوئمنگ پول میں کود گئے۔ ونود کو بھی ٹیوب دے کر ساتھ شامل کر لیا۔ وہ بے چارہ ڈر رہا

تھا۔ اور ہیرو انکل اسے بازو سے تھامے پول میں گھما رہے تھے۔ مجھے بڑا مزہ آرہا تھا۔ ونود کو یوں ڈرتے ہوئے دیکھ کر۔ آنٹی، رنجو، جمنا، انورادھا اور ہیں بخر موس سے گرم گرم چائے پیتے رہے اور رمی کھیلتے رہے اور ہماری توجہ ایک دم سوئمنگ پول سے ہٹ گئی۔

اور پھر اچانک ایک زور کا شور ابھرا، کوئی لڑکا سوئمنگ پول میں ڈوب گیا تھا، لوگ شور مچا رہے تھے اور کنارے کی طرف لپک رہے تھے لیکن پول میں ڈوب کر کسی نے ڈوبتے ہوئے لڑکے کو بچانے کی کوشش نہ کی۔ ہیرو انکل اس سمے ونود کو سہارا دے کر اور ٹیوب اس کے بازو دلا سے نکال کر اسے سوئمنگ پول سے باہر لا رہے تھے۔ انھوں نے ونود کو ایک دم چھوڑ دیا اور سوئمنگ پول سے کود گئے۔ میرا دل دھک سے نکل گیا۔ سب لوگ کنارے پر کھڑے دیکھتے رہے اور ہیرو انکل ڈوبتے ہوئے لڑکے کو کھینچ کر باہر لے آئے اور پھر اسے ایک دم ایسے چھوڑ دیا جیسے اس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ اب اجنبی لوگ اس کے سگے بن رہے تھے۔

وہ اور ونود جب ہمارے قریب پہونچے تو میں نے کہا۔

"ہیرو انکل اگر آپ پانی میں نہ کودتے تو لڑکا ڈوب کر مر جاتا"

"مگر میں کودتا کیسے نہیں" وہ بولے۔

"بہت ہمّت والے ہیں آپ؟"

"وہ ہیرو ہی کیا جس میں ہمّت نہ ہو"

اور پھر وہ بولے۔

"ولود یار بئر پلاؤ ۔"

اور انھوں نے بغیر ونود کا انتظار کئے بئر کی بوتل کھولی اور اسے غٹاغٹ پینا شروع کر دیا۔

"گلاس تو لے لو" آنٹی بولی۔

"وہ تو جھاگ سے ہی بھر جائے گا" انھوں نے ہونٹوں پر جمی تھوڑی سی جھاگ کو اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھ دیا اور بوتل خالی کر کے دور اچھال دی۔

شام کو جب ہم واپس پہونچے تو ونود کو بخار ہو گیا تھا اور ہیرو انکل اس سے مذاق کر رہے تھے۔

"تم سے ہماری ہیروئن ہی اچھی ہے" اور انھوں نے سگریٹ کا سارا دھواں مجھ پر انڈیل دیا۔

"کتنی عادتیں تو آپ کی بہت گندی ہیں ہیرو انکل۔"

"آئی ایم سوری۔"

یہ آخری گفتگو تھی میری اور ہیرو انکل کی۔ اس کے بعد میری اور ان کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ انھوں نے بات چیت کے ذرائع ہی توڑ دیئے تھے اور یہی بات بے حد تلخ تھی۔

اور اسی لیے میں بنا کہے نہیں رہ سکتی۔ آنٹی اور انورادھا بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔

"تمھارے انکل کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے ہم اسپتال جا رہے ہیں"

مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ پر فالج گر گیا ہو۔ وہ اتنا ہی کہہ سکیں اور پھر اسپتال کی طرف بھاگیں۔ میری ان سے اس سے زیادہ بات نہ ہو سکی میں ونود کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے آتے ہی ہم فوراً اسپتال چلے گئے۔ اسپتال پہونچتے تک شام ہو گئی تھی۔

ہیرو انکل ایمرجنسی وارڈ میں پڑے تھے ان کا چہرہ اور جسم پٹیوں سے جکڑے ہوئے تھے ایک ٹرک ان کے اسکوٹر سے ٹکرا گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے ان کا سارا جسم ہی کچل دیا ہو۔ آنٹی اور رانو رادھا سرہانے کی طرف کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انو رادھا سسک اٹھی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ ہیرو انکل آنکھیں بند کیے نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے میں نے پلو سے آنسو پونچھے اور روئی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے ان پر جھک کر آہستہ سے کہا۔

"ہیرو انکل، اپنی ہیروئن سے بات نہیں کرو گے؟"

ان کی چندی ہوئی آنکھیں ذرا سی کھلیں جیسے نشتر اتارنے کے بعد زخم کھل جاتے ہیں۔ میری جان ہی نکل گئی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھرنے کی کوشش ہی میں مر گئی۔ ہونٹ ذرا سے لرزے جیسے کہہ رہے ہوں۔

"آئی ایم سوری" جیسے وہ کچھ بھی نہ کہہ رہے ہوں۔ جیسے وہ چیخ رہے ہوں۔

جیسے وہ سسک بھی نہ سکے ہوں۔

میں نے بڑی مشکل سے چیخ کو روکا۔ اور سسکتے ہوئے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

میرا ہیر دمات کھا گیا تھا، جسے میں نے ایک روز ناراض ہو کر کہا تھا۔

"کبھی عادتیں تو آپ کی بہت ہی گندی ہیں ہیر دانکل!"

تین پیڑوں والا مکان

میری اس کی پہلی ملاقات بہت رسمی سی تھی۔
مجھے سوشل سروس کے ایک نیم سرکاری ادارے میں ایک کانفرنس
میں شریک ہونا تھا۔ یہ ادارہ آج سے کئی برس پہلے امریکہ سے ہندوستان
آئی ایک خاتون نے قائم کیا تھا۔ وہ اس ادارہ کا ایک بڑا ہی اگزیکیٹیو ورکر
تھا اور اپنے فرائض بڑی ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا تھا
اس کی عمر یہی کوئی اٹھائیس انتیس برس کی تھی۔ جسم کا مضبوط لمبا قد اور
تیکھے نقوش۔ اسے چیتن پانڈے کہتے تھے اور وہ مدھیہ پردیش کے بستر
ضلع کا رہنے والا تھا اسی لیے اس کے کردار میں آدی واسیوں جیسا ایک
کھردراپن تھا۔ میں جب پہلے روز اس سے ملا تو مجھے لگا جیسے اس کی شخصیت
میں ایک تناؤ سا تھا۔ لچک کا عنصر اس کی شخصیت میں تھا ہی نہیں
اس لیے اگر کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہوتی تھی تو وہ اسے پسند

نہیں کرتا تھا۔ اس کے ذمّے ادارہ کی مطبوعات کا سارا کام تھا اور اس
میں اسے کسی کی بھی دخل اندازی گوارہ نہیں تھی۔ میں جب پہلی بار۔اس
سے متعارف ہوا تو اس نے کہا۔

"انسان کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں"

"وہ تو ہوتے ہی ہیں۔" میں نے کہا تھا۔

"اپنے اصولوں کے بارے میں کسی بھی کامپرومائیز کی گنجائش نہیں
ہے میرے ہاں۔"

"لیکن اصول بھی تو ہر شخص کی شخصیت کے ساتھ بدلتے رہتے
ہیں۔"

"جی ہاں، اسی لیے ہر شخص سے ان کا کامپرومائیز نہیں ہوسکتا"۔
اس نے جواب دیا تھا۔

"کسی ایک کے ساتھ تو ہوسکتا ہے۔"

"وہ تو ہو ہی سکتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔اشارہ غالبًا
میری ہی طرف تھا۔

اس طرح گفتگو میں مصروف وہ گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے تک
میرے ساتھ آگیا تھا جہاں میری رہائش کا انتظام تھا اور مجھے شام کی چائے
کی دعوت بھی دی تھی۔

اس شام جب میں چائے پینے اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اکیلا
ہی رہتا تھا اور اپنے چھوٹے موٹے کام بھی خود ہی کرتا تھا بلکہ چائے

بھی اس نے خود ہی بنائی تھی - اور میز پر پیالیاں بھی خود ہی رکھی تھیں اور پھر وہ دیر تک باتیں کرتا رہا تھا - مجھے لگا جیسے اس نے خاصا کچھ پڑھ رکھا تھا اور علم و ادب کے کئی شعبوں سے اس کی واقفیت تھی - اس کی پرسنل لائبریری بھی بہت اچھی تھی - اور اس نے کتابوں کو بہت اچھی طرح سنبھال کر رکھا تھا - میری طرح کتابوں کا کباڑ خانہ نہیں بنا تا تھا وہ - اس کے ڈرائنگ روم میں صرف تین چار پینٹنگز تھیں لیکن سبھی ماڈرن اسٹائل میں تھیں اور ان میں بھی کہیں ماحول سے سمجھوتہ کر لینے کی جھلک نہ تھی -

چار پانچ روز کی اس کانفرنس میں مجھے ادارے کی امریکی خاتون سے بھی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا - اس کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی - لیکن اس کی شخصیت میں عجیب طرح کا وقار اور توازن تھا - ایک شام اس نے مجھے اپنے گھر چائے پر بھی بلایا - گفتگو کے دوران اس نے کہا -

" مجھے ادیبوں سے ہمیشہ ہی دلچسپی رہی ہے - میرا خاوند خود ایک ادیب تھا اور جب میں نے اس سے شادی کی اس وقت اس کی مالی حالت بہت اچھی نہیں تھی - "

" تو کیوں کی آپ نے اس سے شادی ؟ "

" کیونکہ مجھے وہ آدمی پسند تھا اور اس لیے بھی کہ مجھے ادب سے دلچسپی تھی اور اس لیے کہ وہ بڑا نان کامپرومائیزنگ شخص تھا - "

" تو آپ کو نان کامپرومائیزنگ آدمی پسند ہیں ؟ "

" اسی لیے مجھے پانڈے پسند ہے - اس کی اور میری عمر میں لگ بھگ

پینتیس برس کا فرق ہے اس لحاظ سے میں اسے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں۔"

"آپ کی اپنی اولاد؟"

"کوئی نہیں۔"

"اسی لیے — پانڈے کو . . . . . ."

"ہاں اسی لیے تو پانڈے کو میں اپنا لڑکا مانتی ہوں۔"

"آپ کا لڑکا خاصا ہونہار ہے۔"

میں نے چیتن پانڈے کی تعریف کی تو وہ خاموش ہوگئیں اور پھر بولیں

"لیکن یہ بڑا UNPREDICTABLE ہے۔"

"از اِٹ؟"

"یس۔ ویری ان پریڈکٹیبل۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں یہ کب کیا کر بیٹھے۔"

اور جب میں نے رخصت چاہی تو اس نے اپنی ایک کتاب مجھے پیش کی اور اس کے پہلے صفحے پر اپنا نام بڑے بولڈ حروف میں لکھا۔ کتاب کے پہلے صفحے پر ایک لائن چھپی تھی۔

"تاریکی کو مت کوسو، صرف ایک چراغ جلا دو۔"

انتساب کی بجائے لکھی یہ لائن مجھے بے حد اچھی لگی اور اس شام گیسٹ ہاؤس میں آکر میں نے سب سے پہلے ایک موم بتی منگوائی اور اسے جلا کر مینٹل پیس پر رکھ دیا۔ تاریکی اور روشنی کی یہ آپسی ڈگمگاتی ہوئی کشمکش بڑی خوبصورت تھی۔

کانفرنس کے بعد جب میں ہریانہ واپس آگیا تو چینتن پانڈے
کی کئی باتیں یاد آتی رہیں۔
میرے واپس آنے سے پہلے اس نے مجھ سے یہ وعدہ لیا تھا
کہ میں دوبارہ جب کبھی ان کے ادارے میں آؤں سیدھا اسی کے
گھر آجاؤں اور وہیں قیام کروں کیونکہ اس کا گھر خاصا کھلا کھلا تھا
اور وہاں بے حد سکون تھا۔ اسی وعدے کے مدّنظر جب کبھی تین چار
بار اس ادارے میں جانا ہوا میں پانڈے کے ہاں ہی ٹھہرا۔ گاڑی
اس چھوٹے سے اسٹیشن پر یا تو صبح بہت ہی سویرے پہنچتی تھی یا
پھر رات کو بہت دیر میں۔ دونوں اوقات بڑے ان کامپرومائیزنگ
تھے۔ اس لیے پانڈے کے گھر تک پہنچنے میں مجھے ہمیشہ ہی دقت ہوتی
تھی اور ہر بار ادارے کے گیٹ پر ڈیوٹی پر کھڑا کوئی ملازم مجھے
اس کے گھر تک پہنچاتا تھا۔ ایرپورٹ یہاں سے بہت دور تھا۔
اس لیے ہوائی جہاز سے آنے میں اور بھی پریشانی ہوتی تھی۔
ایک بار پھر جب میں وہاں گیا تو ان دنوں پانڈے فوک سکولز
آف ڈنمارک میں ایک کورس کے لیے سیکنڈے نیوئیا گیا ہوا تھا اور
چھ ماہ کے بعد جب وہ لوٹا تھا تو اپنے ساتھ ایک ڈینش لڑکی بھی لے
آیا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے میں خود ایک یونیسکو فیلوشپ کے سلسلہ
میں ہندوستان سے باہر چلا گیا اور اس طرح میرے اور چینتن پانڈے
کے درمیان ملنے جلنے اور خط وکتابت کا سلسلہ ایک دم ٹوٹ سا گیا۔

اور ایک بار اچانک، پھر مجھے اُس ادارے میں جانا پڑا اس بار میں ہوائی جہاز سے گیا تھا۔ جب میں ادارے کے کیمپس میں داخل ہوا تو نہ ہی اندھیرا تھا اور نہ ہی ابھی پو پھٹی تھی۔ جہاز صبح چھ بجے پہنچا تھا اور ادھر آتے آتے نو بج گئے تھے۔ میں نے سوچا گیٹ پر کھڑے ملازم سے پوچھنے کی بجائے خود ہی پانڈے کے گھر چلا جاؤں پاس ہی تو تھا اور کئی بار اُدھر آ بھی تو چکا تھا۔ اٹکل سے اس کے گھر پہنچنے کی کوشش کی لیکن اسٹاف کے ایک جیسے مکانوں کی قطار میں پانڈے کا گھر اپنے آپ نہ مل سکا۔ ایک اسٹاف کوارٹر کے باہر کھڑی ایک لڑکی سے جب میں نے پانڈے کے گھر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ "وہ جو آخر میں تین پیڑوں والا مکان ہے۔ وہ پانڈے صاحب کا ہے۔" وہ لڑکی اپنے کوارٹر کے گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئی اور اس نے اشارے سے تین پیڑوں والا مکان مجھے دکھا دیا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر بڑی ہی شگفتہ اور معصوم مسکراہٹ تھی مسکراہٹ کی اُس تازہ بہار پر ابھی کسی خزاں کے سائے نہیں چھائے تھے۔ اتنی اجلی اور پیاری مسکراہٹ بہت ہی کم دیکھنے کو ملی ہے۔ میں جب یورپ میں بھی گیا تو ایسی مسکراہٹ مجھے کہیں نہ ملی۔ ہر مسکراہٹ زخم خوردہ اور مجروح تھی اور لگتا تھا ہونٹوں پر پھیلی ہر مسکراہٹ کے پیچھے ہونٹوں کی قاشوں کے اندر کہیں کسی زخم کا لہو رس رہا تھا۔ اگر ایسی شگفتہ اور معصوم مسکراہٹ کہیں مجھے ملی تھی تو وہ اجنتا کے

غاروں میں بنی تصویروں میں اور کہیں نہیں

"تھینک یو" میں نے لڑکی سے کہا اور اپنا ایر بیگ اٹھائے پانڈے کے گھر کی طرف چل دیا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ میں نے آج تک چیتن پانڈے کے گھر کے باہر لگے یوکلپٹس کے ان تین پیڑوں کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ درخت بڑی سمٹری سے لگے تھے۔ پہلا درخت سب سے بڑا، درمیان والا اس سے چھوٹا اور آخری درخت سب سے چھوٹا۔ پیڑوں کے قد میں جو فرق تھا وہ غالباً ان کی عمر کی وجہ سے تھا۔ کسی بھی پیڑ کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ تینوں ہی پیڑ جوان تھے جب کہ تیسرا پیڑ تو ابھی جوانی کی حدوں کے اندر قدم رکھ ہی رہا تھا۔

میں گیٹ کا پیچ کھول کر اندر داخل ہوا۔ کال بیل کا سوئچ دبایا میوزیکل بیل گونجی اور اسی لمحہ چیتن پانڈے اپنے پورے قد کی لمبائی کے ساتھ دروازے میں استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے پانڈے کے قد اور درمیان والے یوکلپٹس کے درخت میں ایک بہت بڑی مشابہت تھی۔ اس رات میں نے پانڈے سے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں نے کبھی اس کے گھر کے باہر لگے تین یوکلپٹس کے پیڑوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

"ویٹ شوز یور لیک آف اوبزرویشن"

"آف کورس"

"فارگٹ اِٹ۔ آؤ تمہیں کچھ ڈیسنٹ میوزک سناؤں۔

اور اس نے ڈینش لوک گیتوں کے بڑے ہی پیارے ٹیپ لگائے جنھیں وہ ڈنمارک سے اکٹھا کر کے لایا تھا۔ اور پھر وہ اچانک خاموش ہو گیا اور ایک دم اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا۔ ایک گلاس وہ اندر ختم کر کے آیا تھا۔

"تم کیا خاک رائٹر بنو گے۔ نہ شراب پیتے ہو، نہ عورتوں کی باتیں کرتے ہو۔ نہ تم کسی کاز کے لیے کومیٹڈ ہو۔ نہ تمہارے پاس کوئی سلوگن ہے۔ یہ صرف سلوگنز کا زمانہ ہے۔ جو زیادہ اونچا بول سکتا ہے وہ زیادہ کامیاب ہے۔"

"لیکن تم بھی تو اونچا نہیں بولتے۔"

"اسی لیے تو ناکامیاب رہا ہوں۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔"

"گیٹ کے باہر لگے یوکلپٹس کے یہ تین پیڑ میری ناکامیابی کی طویل داستان کے تین باب ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی لمبے گھونٹ میں وہسکی کا گلاس ختم کر ڈالا اور پھر اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لبالب بھرا ہوا گلاس تھا اور ہونٹوں میں سلگتا ہوا سگریٹ۔ کہنے لگا۔

"یہ تمام سگریٹ میڈم لائی ہے میرے لیے۔ اس لیے کہ میں اپنے ذہن کے رستے ہوئے زخموں پر خارین سگریٹوں کی راکھ بکھیرتا رہوں اور خون کی ایک بھی بوند رس کر باہر نہ نکلے۔"

"مگر تم اتنی شراب کیوں پیتے ہو؟"

"کوئی پینے والا ہی میرے جواب سے مطمئن ہو سکتا ہے۔ تم جیسا پاکھنڈی نہیں۔"

اور پھر اس نے بہت زور کا قہقہہ لگایا اور کہا۔

"دراصل ہم سب پاکھنڈی ہیں۔ تم سے بڑا پاکھنڈی شاید میں خود ہوں۔"

اس نے آدھا گلاس ایک گھونٹ میں خالی کر کے اسے پٹکنے کے سے انداز میں میز پر رکھ دیا۔

اس کے بعد اس نے پیٹھ صوفے کی بیک سے لگا لی اور خاموش ہو گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی بند آنکھوں کے کونوں سے اس کے دل کا درد دھیرے دھیرے رسنے لگا۔ میرے لیے یہ بات بالکل نئی تھی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرا دیا۔

"کبھی کبھی میں بے حد سینٹی مینٹل ہو جاتا ہوں۔"

"سینٹی مینٹس تو انسان کا سرمایہ ہیں چیتن۔"

"کبھی کبھی یہ سرمایہ غلط ہاتھوں میں آ کر لٹ بھی جاتا ہے۔ میں بھی اسی طرح لٹا ہوں۔ میرے یوں لٹ جانے کے گواہ میرے یہ تین پیڑ ہیں۔ دراصل یہ پیڑ وہ کتبے ہیں جن کے نیچے میرے ارمانوں کی ادھ کٹی لاشیں دفن ہیں۔ تو میں تمہیں خود ہی ان کتبوں کی کہانی سناتا ہوں۔ یہ گونگ ہیں، خود نہیں بول سکتے۔ اور ان کتبوں پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس لیے کوئی کچھ پڑھ بھی

نہیں سکتا۔ یوں سمجھو کہ میں نہیں یہ کینیتے ہی تم سے بات کر رہے ہیں۔" اُسی لمحہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور مجھے لگا جیسے باہر لگے تین یوکلپٹس کے پیڑوں کی شاخیں دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہی تھیں اپنی آن جانی اور آن سنی زبان میں — "ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر چینتن پانڈے اچانک اندر کے کمرے میں چلا گیا اور میں باہر تیز ہوا کے جھونکوں میں تحلیل یوکلپٹس کے پیڑوں کے سرسراتے ہوئے پتوں کی آواز سنتا رہا۔ مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہے تھے۔

"ہم تینوں پیڑ وہ تین عورتیں ہیں جو پچھلے کچھ برسوں میں اس کی زندگی میں آئیں، اسے اپنی جوان اور مضبوط باہوں میں لینا چاہا اور وہ تڑپ کر ہماری گرفت سے باہر نکل گیا۔

میں کچھ دیر چینتن پانڈے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آیا۔ میں پھر خود ہی اٹھ کر اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سکون سے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے تپائی پر تین فوٹو البم کھلے پڑے تھے جن میں تین مختلف عورتوں کی تصویریں تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر اُس ڈینش لڑکی کی بھی تھی جس سے اس نے تین سال پہلے ڈنمارک میں شادی کی تھی۔ پانڈے غالباً یہی البم لینے کے لیے اندر آیا تھا۔ میں نے جب اسے غور سے دیکھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا وہ کرسی سے ٹیک لگائے گہری نیند سو رہا تھا۔

گیٹ کے باہر ہوا کے تیز جھونکوں میں یوکلپٹس کے تینوں پیڑ

اب بھی آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور پانڈے کی ناکام آرزوں
کے مقبروں پر گڑے کتبے مجھ سے ہم کلام تھے کیوں کہ وہ تو داستان
کہتے کہتے سو گیا تھا۔

معصومہ

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اٹھالیا۔ ہوٹل کے منیجر نے اطلاع دی کہ مس معصومہ حاجی سکریٹری ٹو دی چیف ایڈوائزر ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے منیجر سے کہہ دیا کہ وہ اُسے کمرے ہی میں بھیج دے اور سوچنے لگا ایسا کیا ضروری کام پڑ گیا تھا کہ چیف ایڈوائزر نے اپنی سکریٹری کو ہوٹل میں بھیجنا ضروری سمجھا تھا اور میں ابھی کوئی صحیح رائے قائم نہ کرسکا تھا کہ سیٹوارڈ نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک خوبصورت لڑکی اپنے شانوں پر ترشے ہوئے بال لہراتی اندر داخل ہوئی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کمرے کی فضا نکہت و نور میں ڈوب گئی!

"گڈ مارننگ" جیسے جلترنگ بج اٹھا ہو!

"گڈ مارننگ" میں نے جواب دیا اور اُس خوبصورت لڑکی کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔

"یور نیم پلیز!"

"معصومہ حاجی" اُس نے جواب دیا۔

اور ایک لمحہ کے لیے میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ کریم شیڈ کا

اسکرٹ پہنے دراز قد معصومہ بے حد خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ کئی روز سے میں جن لوگوں کو دیکھتا آ رہا تھا وہ اُن سے ایکدم مختلف تھی۔ اس کے خد و خال، اس کا رنگ، اس کے بال، سبھی کچھ مختلف تھا۔

"آپ کا نام بہت خوبصورت ہے۔"

"تھینکس! یہ نام میری ماں نے رکھا تھا۔ میری ماں کچھ عرصہ ایران رہی تھیں جہاں میرے والد کسی کاروبار کے سلسلے میں مقیم تھے۔ میں ایران ہی میں پیدا ہوئی تھی اور یہ نام بھی مجھے ایران ہی میں ملا تھا۔"

"اب آپ کے والد کہاں ہیں؟"

"دارالسّلام میں۔ وہ چار پانچ سال سے بیمار ہیں۔"

"اور آپ کی والدہ؟"

"وہ بھی دارالسّلام ہی میں ہیں۔ میں ہر سنیچر کو اُن سے ملنے چلی جاتی ہوں۔"

"آپ کتنی مدّت سے یہاں مانزا میں ہیں؟"

"میں تین سال سے یونیسکو کے کلچرل ادارہ سے منسلک ہوں۔"

"تو آپ کو سواحیلی زبان پر تو اچھا عبور ہو گیا ہو گا؟"

"سواحیلی زبان بڑی آسان ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ شامل ہوئے ہیں۔ آپ بھی آٹھ دس دنوں میں بہت کچھ سیکھ جائیں گے۔"

"ایک لفظ تو میں نے سیکھ بھی لیا ہے۔"

"کون سا؟"

"رفیقی!"

"اوہو، دوست!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"رفیق بہت پیارا لفظ ہے۔ اس لیے رفیقی لفظ کو سمجھنے اور اسے بولنے میں بہت لطف آتا ہے۔"

"سواہیلی زبان میں آپ کو ایسے بہت سے پیارے الفاظ ملیں گے۔"

"میں نے تو آپ کو ادھر ہی باتوں میں الجھا لیا۔ آپ کیسے تشریف لائی ہیں؟"

"یہ باتیں بھی ضروری تھیں۔ میں آپ سے یہ عرض کرنے آئی تھی کہ آپ کے لوکوبا جانے کا پروگرام طے ہو گیا ہے۔ آپ کا ڈیلی گیشن آج رات بوٹ سے لوکوبا جائے گا اور صبح آپ وہاں پہنچ جائیں گے۔ آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کافی بڑی اِن ہوٹل میں کیا گیا ہے۔"

"پہلے تو کار سے جانے کا پروگرام تھا؟"

"جی ہاں، پروگرام تو یہی تھا کہ کل صبح آپ یہاں سے چلیں گے اور شام کو لوکوبا پہنچ جائیں گے۔ لیکن اُدھر کی سڑکیں بہت اچھی نہیں ہیں۔ اس لیے سفر میں آپ کو بہت تکلیف ہو گی۔ یہی سوچ کر ایڈوائزر صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ بوٹ ہی سے جائیں وہ کسی ضروری کام سے دارالسلام چلے گئے ہیں اور آپ کو دو دنوں کے بعد لوکوبا ہی

میں ملیں گے۔"

"تھینکس!"

"اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو سٹیمر پہ سی آف کر سکتی ہوں۔"

"شکریہ!"

اور اس کے بعد معصومہ شاخِ گل کی طرح لچکتی چلی گئی لیکن اپنے شباب اور رعنائی کی خوشبو چھوڑ گئی۔ میں اُس کے جانے کے بعد دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

شام کو وہ سٹیمر کے ریسیپشن پر موجود تھی اور اپنی دلنواز مسکراہٹ کی چاندنی میں نہائی ہوئی ڈیلی گیشن کے سب ممبروں سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آپ نے سواہیلی کا کوئی اور لفظ بھی سیکھا ہے؟"

"قریبو۔"

"یعنی ویل کم!" اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور مجھے محسوس ہوا وکٹوریہ جھیل کی بے پناہ وسعتوں میں مچلتی ہوئی لہروں نے خوشگوار چھینٹوں سے مجھے شرابور کر دیا۔

اس کے بعد معصومہ ہمارے ڈیلی گیشن کی واحد خاتون ممبر مس پاٹل سے باتوں میں لگ گئی۔ مس پاٹل گجراتی ہے اور اس نے یہاں بہت سے گجراتی لوگوں سے رابطہ پیدا کر لیا ہے۔ اس لیے وہ ہمارے ساتھ کم اور اپنے نئے واقف کاروں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی ہے۔ معصومہ

اور مس پاٹل ایک طرف کھڑی باتیں کرتی رہیں اور ہمارا سامان اسٹیمر میں پہنچ گیا اور ہم اسٹیمر کی طرف بڑھنے لگے۔ اور معصومہ نے ایک بار پھر سب سے ہاتھ ملایا اور آخر میں اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔

"سلاما (خدا حافظ)!"

"خدا حافظ!" میں نے کہا۔

اس کے بعد معصومہ چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارا اسٹیمر بھی وکٹوریہ جھیل کے گہرے پانیوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ جھیل مانزا سے لے کر مغرب تک کئی سو میلوں تک پھیلی ہے۔ اس کا پانی بہت گہرا ہے۔ اسے جھیل کہنا تو محض رسمًا ہے ورنہ یہ تو اچھا خاصا سمندر ہے۔ لیکن اس جھیل کا پانی اچھا نہیں اس لیے اس کا کوئی معقول استعمال نہیں کیا جاتا۔

بوکوبا کے اردگرد کے علاقے میں گھومنے اور مشرقی افریقہ کے دیہات میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے گھروں میں بسے لوگوں سے ملنے کا ایک الگ ہی لطف تھا۔ یہ لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی زندگی کے جزیروں کو لیے خوش و خرم ہیں۔ ہر گھر کے ساتھ زمین کا ایک ٹکڑا ہے جس میں وہ کیلے کی کاشت کرتے ہیں۔ شکر قندی اور موم پھلی اگاتے ہیں اور بیچ بیچ میں مکّی کے دانے پھینک دیتے ہیں۔ اس طرح انھیں کچھ اناج بھی مہیا ہو جاتا ہے۔ یہ معصوم لوگ اپنی زندگیوں کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں ہنستے ہیں، روتے ہیں، محبت کرتے ہیں، بیمار ہوتے ہیں اور انھیں جزیروں میں فنا کی گود میں سو جاتے ہیں۔ حیات و موت کا یہ مختصر سا ڈرامہ کتنا معنی خیز ہے لیکن میں جب ان لوگوں سے ملا۔ ان سے

باتیں کیں تو مجھے محسوس ہوا، ان میں ایک اچھی اور خوشگوار زندگی گزارنے
کا احساس اب پیدا ہو چکا ہے۔ وہ اب محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ملک پچھڑا
ہوا ہے اس لیے انھیں اپنی ترقی کے لیے زیادہ محنت اور کوشش کرنی
چاہیے۔ ملکوں اور قوموں میں جب یہ احساس جاگ جاتا ہے تو پھر کوئی
بھی اجنبی طاقت انھیں دبا کر نہیں رکھ سکتی، چاہے وہ طاقت کتنی
ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ احساس کی طاقت سے زیادہ مضبوط طاقت
شاید کوئی بھی نہیں۔ میں نے اور ڈیلی گیشن کے دوسرے افراد نے وہ کھانا
بھی کھایا جو یہ دیہاتی لوگ کھاتے ہیں اور جس پر اُن کی زندگیوں کا دار
و مدار ہے۔ کیلے کے پتوں پر کھانا پروسنے سے پہلے ہاتھ دھلانا مجھے
بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔ یہ لوگ غریب اور پچھڑے ہوئے سہی۔ اِن
کے رنگ کالے سہی۔ اِن کے بال بہت چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت
نہیں، لیکن ان کے دل بہت خوبصورت ہیں۔ اِن کے احساس میں گرمی
ہے اور جذبات میں خلوص کی روشنی ہے اِس لیے یہ سبھی لوگ اچھے ہیں،
خوبصورت ہیں اور جان دار ہیں۔

چار دن کے جان توڑ سفر کے بعد جب ہم مانزا واپس پہنچے تو
ہمارے ساتھ چیف ایڈوائزر بھی موجود تھے جو دارالسّلام سے بوکوبا
پہنچ کر ہمارے ڈیلی گیشن کی سہولیات کو دیکھنے کے لیے ہمارے ساتھ
رہے تھے۔ میں نے دیکھا معصومہ استقبال کو موجود تھی۔ وہ اپنے
بوس کے لیے وہاں تھی یا سبھی ایسے موقعوں پر موجود رہتی ہے یا صرف ہمارے

ڈیلی گبشن کی آمد پر ہی استقبال کو آئی تھی، یہ جاننے کی میں نے کوشش نہیں کی۔ اتنا ہی بہت تھا کہ اس اجنبی ملک میں کوئی ایسی ہستی بھی موجود تھی جو اپنی دلنواز مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کر رہی تھی۔ ہماری راہ میں حسن و رعنائی کے پھول بکھر رہی تھی۔

اگلا دن اتوار تھا۔ معصومہ نے مجھ سے اتوار کے پروگرام کے بارے میں پوچھا۔ میرے کچھ ساتھی بے حد تھکے ہوئے تھے اور ہوٹل میں آرام کرنا چاہتے تھے۔ مس پاٹل اپنے کسی نئے شناسا گجراتی گھرانے کے ساتھ اتوار کا دن گزارنا چاہتی تھی۔ ایک صرف میں تھا جسے ہوٹل میں پڑے رہنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اِدھر اُدھر گھومنے کی خواہش تھی۔ لیکن اس وقت میں نے معصومہ سے کچھ نہیں کہا اور سیدھا ہوٹل چلا آیا اور اپنے آرام دہ بستر میں لیٹے لیٹے اُن اجنبی ہواؤں میں بڑا سانس لیتا رہا جو ہوائیں صرف دو دن اور ہمارا ساتھ دے سکتی تھیں۔ اُس کے بعد ہمیں اس جگہ کو چھوڑ دینا تھا۔

اتوار کی صبح کو میں نے اپنے کچھ کپڑے دھوئے اور نچلی منزل پر ہوٹل کے منیجر کو انھیں پریس کرانے کے لیے کہنے کونٹر پر گیا۔ دیکھا تو معصومہ کھڑی تھی۔

"Jambo Subuu" (صبح کا سلام) اس نے مسکرا کر مجھے مخاطب کیا۔

"Asanta" (شکریہ) "یہ صبح سویرے کیسے آنا ہوا؟"

"لیکن آپ تو جیسے ابھی سو ہی رہے ہیں!"

"تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں ابھی سو ہی رہا ہوں۔ ابھی اِن اجنبی ہواؤں کے جادو کی غنودگی چھٹی نہیں۔"

"تو جلدی سے تیار ہو جائیے میں ایک گھنٹہ میں واپس آ رہی ہوں"

"کہیں جانا ہے کیا؟"

"سانی آئی لینڈ پر۔"

"یہ کیا جگہ ہے؟"

"یہاں کا ایک پکنک سپاٹ ہے جہاں جنگلی جانور بالکل قدرتی ماحول میں رکھے گئے ہیں۔ فیری سے وہاں جانا ہوگا۔"

"لیکن مجھے تو پانی سے ڈر لگتا ہے!"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ تیار ہو جائیے۔ سلاما!"

"سلاما!" میں نے کہا اور وہ لمحہ بھر میں مجھے ہوٹل کے ری سیپشن ہال میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔

میں جلدی سے تیار ہوا۔ اپنے ساتھیوں سے بھی پوچھا لیکن کوئی بھی کہیں جانا نہ چاہتا تھا۔ میں نیچے ری سیپشن ہال میں آ گیا اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے اخبار دیکھنے اور سگریٹ پینے لگا۔

ٹھیک ایک گھنٹہ کے بعد معصومہ آ گئی اور اپنی دلنواز مسکراہٹ کی پھوار سے ماحول کو نہلا دیا۔ جیسے فضا نکہت و نور میں ڈوب گئی۔

سنانی آئی لینڈ وکٹوریہ جھیل کے درمیان کنارے سے کوئی تین میل دور ہے ۔ میں فیری کے ٹکٹ خرید نے لگا تو معصومہ نے روک دیا ۔

"آپ مہمان ہیں !"

وہ اپنے ساتھ کافی سے بھری تھرمس اور کچھ سنیکس بھی لے آئی تھی ۔ جیسے آج کا تمام دن وہ اسی آئی لینڈ پر گزارنا چاہتی تھی ۔

فیری میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا ۔

"لیکن انوار کو تمھیں دارالسّلام جانا ہوتا ہے ؟"

"کوئی مہمان آ جائے تو یہ پروگرام منسوخ بھی ہو سکتا ہے ۔"

"میں تمھارا مہمان تو نہیں ہوں ، ڈیلی گیشن کے ممبرز تو سرکاری مہمان ہیں ۔"

"تو آپ سرکاری مہمان بننا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں ، مجھے معلوم نہ تھا ۔"

میں نے دیکھا معصومہ کا چہرہ اداس ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں ۔ اسی لمحہ جھیل کی ایک موج نے فیری سے ٹکرا کر اس کے چہرے کو پانی کے چھینٹوں سے دھو ڈالا ۔

"آئی ایم سوری ! میرا مطلب تھا تمھارے والد اور تمھاری والدہ انتظار کریں گے ۔"

"میں نے انھیں کل ہی اطّلاع کر دی تھی ۔"

میں خاموش رہا ۔ میں نے انجانے میں اس کا دل دکھایا تھا ۔ اس کے لیے مجھے افسوس تھا ۔ لیکن اب کچھ کہنا فضول تھا خاموشی ہی بہتر تھی ۔

سنائی کا مطلب سواحیلی زبان میں دو ۲ ہے ۔ کہتے ہیں کہ جب یہ جزیرہ دریافت کیا گیا تھا تو اس وقت دو بجے تھے ۔ اس لیے اس کا نام سنائی آئی لینڈ رکھ دیا گیا ۔ سارا دن ساتھ گزارنے کے بعد ہم واپس پہنچے تو میرے ساتھی سینما چلے گئے تھے ۔ معصومہ کو میں نے چائے کے لیے کہا اور ہم دونوں اوپر کمرے میں آ گئے ۔ سٹیوارڈ چائے کمرے ہی میں لے آیا ۔

"یہاں آپ نے چائے کے باغات بھی دیکھے ہیں ؟"

"ہاں دیکھے ہیں ۔ یہاں کی چائے کا ذائقہ مختلف ہے ۔ پتی ذرا تیز ہو جائے تو چائے کڑوی ہو جاتی ہے ۔"

"تو شکر زیادہ ڈال لیا کریں ۔"

"میں تو چائے میں شکر ڈالتا ہی نہیں ۔"

"کیوں ؟"

"اس سے چائے کا حقیقی ذائقہ ختم ہو جاتا ہے ۔"

"تو آپ کو خالص ہی چیزیں پسند ہیں ؟"

"یہی سمجھ لو ! اسی لیے مجھے سیدھے سادے معصوم لوگ پسند ہیں ۔ اور سچی صاف باتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں ۔ بنا میک اپ کے چہرے اچھے معلوم ہوتے ہیں ۔"

"اور ــــ ؟" معصومہ کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔

"اور ایسے ہی دھلے ہوئے کھلے قہقہے مجھے پسند ہیں ۔"

معصومہ نے بے حد معصوم نظروں سے میری طرف دیکھا ۔

میں ہندوستان سے آتے وقت کچھ چھوٹے چھوٹے تحفے ساتھ لایا تھا جو میں اِس اجنبی ملک میں نئے دوستوں کو پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اب تک وہ چھوٹے چھوٹے تحفے، وہ دوستی کے ننھے ننھے پیغام میرے اٹیچی کیس ہی میں بند پڑے تھے۔ مجھے اِن دنوں میں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہ آیا تھا جسے میں کوئی تحفہ پیش کرتا، جسے میں دوستی کا پیغام دے سکتا۔

میں نے اپنا اٹیچی کیس کھولا اور لکھنؤ کے حضرت گنج کے ایمپوریم سے خریدا ہوا بے حد چمکدار کینڈل اسٹینڈ نکال کر معصومہ کو پیش کر دیا۔ کینڈل اسٹینڈ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

"Asanteaana" (بہت بہت شکریہ!)

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے شام کی ساری شفق اس کے چہرے پر کھل اٹھی تھی!

ابھی ابھی معصومہ مجھے ایرپورٹ پر چھوڑنے آئی ہے۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر اداسی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تمناؤں کی جھلک ہے اس کے سیاہ بال جو خشک ہوا کے جھونکوں میں جھول رہے ہیں، بہت ہی غمگین معلوم ہو رہے ہیں۔ بال بھی تو غمگین معلوم ہو سکتے ہیں کبھی کبھی!

"Nasaida" (خدا تمھیں سلامت رکھے!) اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے کہا ہے۔

اور پھر اُس نے میرے بہت ہی قریب ہو کر میرے کانوں میں سرگوشی کے انداز

میں رس گھولا ہے اور میرے کانوں کی لویں اُس کی گرم سانس سے اونگھ گئی ہیں۔

"میں تمھارے دیئے ہوئے کینڈل اسٹینڈ میں ہر رات موم بتّی جلایا کروں گی، ٹھیک نو بجے رات میں، جب تم نے پہلی بار میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا تھا اور موم بتّی کے اِس پگھلتے ہوئے موم میں اُن جذبات کی گرمی محسوس کروں گی جن سے میں تمھیں مل کر روشناس ہوئی تھی اور جوں جوں موم بتی کا ہلکا ہلکا دُھواں غیر محسوس طور پر کمرے کی فضا میں پھیلتا جائے گا مجھے محسوس ہوگا کہ وہ اجنبی ہوائیں جن میں تم نے کچھ روز سانس لی تھی اب بھی تمھاری یادوں سے آباد ہیں!"

ہوائی جہاز نے اڑان بھرلی ہے اور میں کھڑکی کے ساتھ لگا اپنی سیٹ سے معصومہ کو وزیٹرز گیلری میں کھڑے دیکھ رہا ہوں اور اس کے ہاتھ میں سُرخ رومال آہستہ آہستہ کانپ رہا ہے جیسے اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی جھیلوں پر پلکوں کے سائے لرزا کرتے ہیں!!

